ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 26)
نامعقول
(تحریر حسام بٹ)
عقیل قریشی - یاسر حسنین - سیف الملوک عباس
محمد نعمان - ناصر بلوچ - محمد سجاد بھٹی
سسپنس ڈائجسٹ : اپریل 2007

نامعقول

ملک صفدر حیات

انسان ہے اور جرم بھی ہے ...... چھوٹا جرم یا بڑا جرم اس کا انحصار مجرم کے حالات اور سوچ پر ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹے جرم کو بھی بڑا سمجھتا ہے اور کوئی قتل جیسے بھیانک اور سفاک جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی نہیں کپکپاتا۔ ایسے ہی جرم صفت انسانوں میں سے چند کی کہانی ملک صاحب کی زبانی۔

زر، زن اور زمین کے لیے برپا مناقشوں میں سے ایک مناقشہ کی سچی کہانی

زندگی دُکھ اور سکھ سے عبارت ہے!

درخت کڑی دھوپ میں جلتا ہے تو اس کے وجود سے سایہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سکون کی سانس لینے والوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں یہ آرام پہنچانے کے لیے وہ درخت خود کو کتنے بڑے عذاب سے گزار رہا ہوگا۔ یہ طے ہے کہ تکلیف اٹھائے بغیر راحت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ الگ بات کہ بعض معاملات میں کسی کو آرام و سکون فراہم کرنے کی خاطر کوئی دوسرا مشکلات سے دوچار ہوجائے۔

کہانی کی فضا سے آپ کو متعارف کرانے کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ موسمِ سرما کی ایک اُداس اور خنک صبح تھی۔ فروری کا مہینا شروع ہوچکا تھا لیکن سردی گویا کسی ضدی کمبل کے مانند ماحول سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ دُھند کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ صبح و شام کی کیفیت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا یہ سال اسی ٹھنڈے ٹھار موسم کی نذر ہوجائے گا۔ اس روز جب میں تھانے پہنچا تو بیرونی ماحول نے تھانے کی اندرونی فضا کو بھی منجمد کر رکھا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار خوش بخت میرے کمرے میں آگیا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' اس نے بڑی کراری آواز میں مجھے سلام کیا اور پوچھنے لگا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو انگیٹھی لاکر یہاں رکھ دوں؟''

میں نے سر سے پاؤں تک بغور اس کا جائزہ لیا اور اس کے سلام کا جواب دے کر استفسار کیا۔ ''خوش بخت! تمہاری عمر کتنی ہوگی؟''

یہ اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ دراصل میں نے اس کی عمر کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا کہ اس یخ بستہ موسم میں اسے گرم کپڑوں کے کسی خاص اہتمام کے بغیر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی کراری اور ہشاش بشاش آواز نے بھی مجھے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ شدید سردی کے باعث تو منہ سے خارج ہونے والے الفاظ بھی جمے جارہے تھے اور وہ تھا کہ جیسے اس پر کسی شے کا اثر ہی نہ ہو۔

اس نے اُلجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا اور بتایا۔ ''ملک صاحب! آپ کی دُعاؤں سے آنے والے کاتک میں پورے پینتالیس سال کا ہوجاؤں گا۔'' پھر وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میری عمر کے بارے میں کیوں پوچھا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''خوش بخت! تم عمر میں مجھ سے کوئی چھ سات سال بڑے ہی ہوگے لیکن مجھے تو تم دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی پیش کررہے ہو اور خود کسی گبرو کی طرح اس سخت سرد موسم کے لیے ایک چیلنج بنے دکھائی دیتے ہو۔ کیا تمہیں سردی نہیں لگتی؟''

''سردی کا موسم ہے تو وہ لگے گی بھی ضرور۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''بس جناب! اپنی اپنی برداشت کی بات ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم سردی کو برداشت کررہے ہو؟''

وہ اپنے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو رستم خان کی مہربانی ہے جناب ...... جس کی وجہ سے میرے اندر شدید سردی کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ اگر میں بہت زیادہ گرم کپڑے پہن لوں تو سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حدت سے میرا جسم پھٹ جائے گا۔ مجھے اپنے وجود میں سے ایک آگ سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خوش بخت! تم نے اپنی جو کیفیت بیان

کی ہے وہ تو میڈیکل پرابلم ہے۔ بعض لوگوں کو موسم سرما میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے اور اس کا سبب کیلشیم اور بی کمپلیکس کی کمی بتایا جاتا ہے۔ بہر حال......'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اس سے پوچھ لیا۔

''تم نے کسی رستم خان کی مہربانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کیا سلسلہ ہے؟''

وہ یکلخت اُداس ہوگیا پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''رستم خان میرا جگری دوست تھا لیکن افسوس کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔'' وہ لمحے بھر کو گمبھیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''رستم برٹش آرمی میں تھا اور حالات و واقعات کی مناسبت سے جگہ جگہ اس کی پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ میں اپنی فرصت میں اکثر و بیشتر اس سے ملنے چلا جاتا تھا۔ وہ بہت جی دار، یار باش اور متواضع شخص تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود کو بھی پکا کر دوستوں کے سامنے سجا دے۔ جس بندے کو کھانے پینے کا شوق ہو، وہ بہت اچھا باورچی بھی ہوتا ہے۔ یہی حال رستم خان کا بھی تھا۔ وہ نہایت ہی لذیذ اور مزیدار کھانے بناتا تھا۔ ایک مرتبہ میں موسم سرما میں اس کے پاس گیا ہوا تھا کہ اس نے مجھے بھنا ہوا گوشت کھلایا۔ اس کے ہاتھ کا بھنا ہوا گوشت تو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ کھایا تھا لیکن اس بار ذائقہ بہت ہی مختلف پایا تو میں نے اس سے پوچھا، یار! آج تم نے کس جانور کو بھون ڈالا ہے؟ بچھیا کا تازہ گوشت ہے یار، اس نے جواب دیا۔ میں نے سوال کیا، بچھیا کا گوشت تو تم نے پہلے بھی کئی دفعہ بھون کر مجھے کھلایا ہے مگر آج ذائقہ بالکل مختلف ہے۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا اور استفسار کیا۔ ''کیا آج بہت بدذائقہ گوشت بنا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''نہیں پہلے سے زیادہ خوش ذائقہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''صرف ''زیادہ'' خوش ذائقہ ہی نہیں بلکہ زیادہ طاقت والا بھی ہے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا، زیادہ طاقت والا کیا مطلب؟ اس نے بتایا کہ یہ گوشت خاص طور پر مگرمچھ کی چربی سے تیار شدہ گھی میں پکایا گیا ہے۔ میں نے استعجابیہ انداز میں چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا، میرے ایک دوست نے پتا نہیں کہاں سے ایک سیر گھی کا یہ ڈبا مہیا کر کے مجھے دیا ہے۔ میں آدھا ختم کر چکا ہوں اور اپنے بدن میں اس کے بڑے اُمنگ افزا اثرات محسوس کر رہا ہوں۔ انشا اللہ! دیکھنا، تم بھی اس کی تعریف کرو گے......''

حوالدار خوش بخت سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! وہ اٹھتی ہوئی جوانی کا زمانہ تھا۔ یہ ایک ایسی لااُبالی اور بے پروا عمر ہوتی ہے کہ انسان ہر شے کو تسخیر کرنے کی دُھن میں رہتا ہے۔ وہ ہر چیلنج کو بچوں کا کھیل سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ کائنات میں پائی جانے والی تمام تر طاقتوں اور توانائیوں کو اپنے وجود میں سمیٹ لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ میں بھی اس بار شوق شوق میں کچھ زیادہ ہی دن رستم خان کے پاس ٹھہر گیا تھا۔''

آخری جملہ اس نے خاصے جھینپے ہوئے انداز میں ادا کیا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھ لیا۔ ''اور...... اُن ''کچھ زیادہ'' دنوں میں رستم خان تمہیں مگرمچھ کے گھی میں بھنا ہوا گوشت کھلاتا رہا تھا...... ہیں نا؟''

''جی......!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں مگرمچھ اور افریقی گوریلے کی چربی کے اثرات کو زیرِ بحث لا کر کسی طولانی گفتگو کا در وا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا سرسری انداز میں حوالدار سے کہا۔

''خوش بخت! میں تمہاری طرح کے خطرناک اور حیرت انگیز تجربات کا شوقین رہا ہوں اور نہ ہی ایسی الف لیلوی باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ تم اپنے جسم میں چبھنے والی سوئیوں کا کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ یا نہ کراؤ، تمہاری مرضی ہے لیکن جلدی سے جا کر میرے لیے دہکتے ہوئے کوئلوں والی انگیٹھی اٹھا لاؤ تاکہ میں اپنے ماحول کے درجۂ حرارت کو بڑھا سکوں۔''

''او کے سر!'' اس نے فرماں برداری سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ اس نے دہکتے ہوئے کوئلوں والی گرما گرم انگیٹھی میری کرسی سے تھوڑے فاصلے پر رکھی اور اطلاع فراہم کرنے والے انداز میں بتایا۔

''ملک صاحب! ماسٹر جمیل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''ماسٹر جمیل کون؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

حوالدار نے بتایا۔ ''ماسٹر جمیل اِدھر ہی سوہدرہ کلاں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتا ہے۔''

ان دنوں میں موضع سوہدرہ کلاں کے تھانے میں تعینات تھا۔ اس علاقے میں صرف ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے تاہم لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کی غالب تعداد وہاں پڑھنے آتی تھی۔ آج سے پہلے ماسٹر جمیل سے براہِ راست میرا واسطہ نہیں پڑا تھا لہٰذا میں اسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔

میں نے حوالدار سے پوچھ لیا۔ ''ماسٹر جمیل کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

''کام میں نے پوچھا تھا۔'' خوش بخت نے بتایا۔ ''لیکن وہ کہتا ہے کہ آپ ہی سے بات کرے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم اسے میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

حوالدار خوش بخت کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک دُبلا پتلا دراز قامت شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پر گرم جرسی پہن رکھی تھی اور...... ایک ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ وضع قطع اور انداز و اطوار سے وہ معقول اور سمجھ دار شخص نظر آتا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے مجھے سلام کیا اور سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرا نام جمیل احمد ہے...... ماسٹر جمیل......''

میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مہربان لہجے میں کہا۔ ''بیٹھ جائیں ماسٹر صاحب!''

وہ با آہستگی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے تھیلے کو اس نے کمرے کے فرش پر رکھ دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''جی ماسٹر صاحب! اتنی ٹھنڈی ٹھار صبح کو آپ مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''میرا خیال ہے، خیریت نہیں ہے......!'' اس نے مبہم سے انداز میں کہا اور نیچے رکھے ہوئے تھیلے کو اٹھا کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ خود دیکھ لیں جناب!''

میں نے اُلجھن زدہ انداز میں اس کے ہاتھ سے مذکورہ تھیلا لے لیا۔ میں نہیں جانتا تھا وہ اس تھیلے میں کیا ڈال کر مجھے دکھانے لایا تھا۔ میں چونکہ نہیں جانتا تھا لہٰذا تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے وہ تھیلا کھول لیا۔

اس تھیلے میں سے جو کچھ برآمد ہوا اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک عام سی استعمال شدہ درانتی تھی لیکن خاص بات یہ تھی کہ مجھے اس کے دندانے دار پھل پر جما ہوا خون نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کی سیاہی مائل رنگت کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ خون تھا جو خشک ہوجانے کے بعد اپنا اصل رنگ و روپ کھو چکا تھا۔ میرے فوری اور محتاط اندازے کے مطابق اس خون کو جم کر خشک ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

میں نے خون آلود درانتی کو اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر بہ غور اس کا جائزہ لیا پھر سوالیہ نظر سے ماسٹر جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! اس درانتی کی کیا کہانی ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں جناب!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں اسے آپ کے پاس اسی لیے لایا ہوں تاکہ آپ اس سے منسوب کہانی کا پتا چلا سکیں۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''یہ درانتی آپ کو کہاں سے ملی ہے؟''

وہ سادگی سے بولی۔ ''یہ میری نہیں بلکہ میری گھر والی کی دریافت ہے جناب!''

میں سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تاکہ وہ اس خون آلود درانتی کے بارے میں مزید کچھ بتائے۔ جب وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھا۔

''آپ کی گھر والی نے اسے کہاں سے دریافت کیا ہے ماسٹر صاحب؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''پڑھولے میں سے!''

''پڑھولے میں سے؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کوثر...... میری گھر

والی پڑھولے میں سے گندم نکال رہی تھی کہ اس کا ہاتھ کسی ٹھوس اور تیز دھار شے سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی چیخ خارج ہوئی۔ اس وقت میری بڑی بیٹی اس کے قریب کھڑی تھی۔ کوثر نے چیخنے کے بعد پڑھولے کے موکھلے سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کی تین اُنگلیوں میں سے خون رس رہا تھا۔ میری بیٹی خالدہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور آ کر مجھے بتایا کہ امی کا ہاتھ زخمی ہوگیا ہے۔ میں یہ خبر سن کر فوراً اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا اور دیکھا کہ واقعی اس کی تین اُنگلیاں گھائل ہوچکی تھیں۔ میں نے کوثر سے پوچھا، یہ سب کیسے ہوا؟ اس نے پڑھولے کے موکھلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے اس حادثے کے بارے میں بتایا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ پڑھولے کے اندر گندم میں ایسی تیز دھار کون سی چیز ہوسکتی ہے جس سے ہاتھ زخمی ہوجائے۔''

ماسٹر جمیل نے سانس درست کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''میں نے سوچا، پڑھولے کو تو میں بعد میں چیک کروں گا، پہلے بیوی کے زخمی ہاتھ کا علاج کرلوں چنانچہ میں نے کوثر کے زخمی ہاتھ کو اچھی طرح صاف کر کے اس پر صاف کپڑے کی پٹی باندھ دی، اس کے بعد پڑھولے کی جانب متوجہ ہوگیا۔''

گاؤں دیہات میں اناج کا ذخیرہ کرنے کے لیے مٹی کے بڑے بڑے ''پڑھولے'' بنائے جاتے ہیں۔ پڑھولے کو آپ مٹی کا ایک بڑا سا ڈرم سمجھ لیں۔ پڑھولے عموماً گولائی میں تعمیر کیے جاتے ہیں جن کا قطر لگ بھگ ڈھائی تین فٹ رکھا جاتا ہے اور اُونچائی پانچ فٹ سے لے کر دس فٹ تک بھی ہوسکتی ہے۔ اس کے اندر اناج بھرنے کے لیے پڑھولے کی چھت میں ایک بڑا سا سوراخ موجود ہوتا ہے۔ جب پڑھولے کو اناج سے بھر دیا جاتا ہے تو اس سوراخ کو کسی شے سے ڈھک کر بند کردیتے ہیں۔ پڑھولے میں سے حسب ضرورت اناج نکالنے کے لیے اس کے زیریں حصے میں ایک موکھلا موجود ہوتا ہے جس کا قطر عموماً پانچ سے چھ انچ رکھا جاتا ہے۔ اس موکھلے میں سے اناج نکالنے کے بعد کپڑا ٹھونس کر اس کا منہ بند کردیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس موکھلے کے لیے باقاعدہ ڈھکن بھی بنا لیتے ہیں جیسا کہ آپ نے دودھ والے ڈرم کا ڈھکن دیکھا ہوگا...... اور بعض لوگ وہاں ایک پٹ کا چھوٹا سا دروازہ لگا لیتے ہیں۔

''میں پڑھولے کی جانب بڑھا تو میری گھر والی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔'' ماسٹر جمیل نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس نے مجھے تاکید کی کہ میں بہت محتاط رہوں۔ بہرحال، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس موکھلے کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میرا متلاشی ہاتھ اس درانتی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کے خطرناک پھل نے میری بیوی کی تین اُنگلیاں زخمی کردی تھیں۔'' اس نے میرے ہاتھ میں موجود خون آلود درانتی کی طرف دیکھا، ایک خفیف سی جھرجھری لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس درانتی کو آڑا ٹیڑھا کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے پڑھولے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے پڑھولے کے موکھلے کو ایک طرف سے تھوڑا توڑنا بھی پڑا تھا۔ درانتی باہر آئی تو اس کے پھل پر جمے ہوئے خون نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا اور یہی مجبوری مجھے صبح ہی صبح آپ کے پاس لے آئی ہے۔ اس خون آلود درانتی کی کیا کہانی ہے، یہ آپ پتا چلائیں گے تھانے دار صاحب۔''

ماسٹر جمیل اپنا بیان مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میرا ذہن بار بار مجھے اشارہ دے رہا تھا کہ درانتی کے دندانے دار پھل پر جما ہوا وہ خون کسی انسان کا ہے اور...... یہ انتہائی تشویش ناک سوچ تھی۔ اس سوچ کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ اس درانتی کی مدد سے کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قتل کی کسی واردات کی اطلاع تھانے تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد پولیس قاتل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ آلۂ قتل کبھی قاتل سے پہلے ہاتھ لگ جاتا ہے اور کبھی قاتل کی گرفتاری کے بعد، اس کی نشاندہی پر آلۂ قتل برآمد کرلیا جاتا ہے۔ موجودہ معاملے میں...... اگر میرا ذہن بالکل درست اشارہ دے رہا تھا تو پھر صورتِ حال کچھ ایسی ہوجاتی تھی کہ آلۂ قتل سب سے پہلے مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس کی مدد سے مجھے قاتل اور مقتول تک رسائی حاصل کرنا تھی۔

چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد میں نے کریدنے والے انداز میں ماسٹر جمیل سے پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ کے گھر میں کل کتنے افراد رہائش پذیر ہیں؟''

''صرف میرے اپنے گھر کے لوگ ہیں جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کل پانچ افراد...... میں، میری بیوی کوثر پروین اور ہمارے تین بچے۔'' پھر وہ اپنے بچوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ''چھ سالہ خالدہ، پانچ سالہ شبیر اور دو سالہ شفاعت۔''

یہ تینوں بچے اس قابل نہیں تھے کہ کسی خون آلود درانتی کو پڑھولے کے اندر پہنچا سکیں لہٰذا میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نگاہ کو ماسٹر اور اس کی بیوی پر مرکوز کر دیا۔ چند لمحات تک اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''ماسٹر صاحب! کیا آپ یا آپ کی گھر والی اس خطرناک خون آلود درانتی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

اس نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''نہیں جناب! ہم نے آج پہلی مرتبہ اس منحوس کی شکل دیکھی ہے جس نے میری بیوی کی تین اُنگلیاں زخمی کر دی ہیں۔''

''ہوں!'' میں نے درانتی کو میز پر پڑے تھیلے کے اوپر رکھ دیا اور کہا۔ ''ماسٹر صاحب! اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ یہ درانتی آج صبح آپ کے گھر میں موجود گندم والے پڑھولے میں سے برآمد ہوئی ہے۔ وہ پڑھولا چونکہ آپ کے گھر میں ہے لہٰذا درانتی کے بارے میں، میں آپ سے استفسار کر رہا ہوں۔ آپ اس درانتی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خون آلود درانتی گندم والے پڑھولے کے اندر کیسے پہنچ گئی؟''

''یہی بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھانے دار صاحب!'' وہ قدرے اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کو یقیناً معلوم ہوگا، میں موضع سوہدرہ کلاں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں جماعت چہارم کو پڑھاتا ہوں۔ یہی ماسٹری میرا رزق روزگار ہے۔ زراعت اور کھیتی باڑی سے کبھی میرا تعلق نہیں رہا اس لیے درانتی یا ایسے ہی کسی اور زرعی آلے کا میرے گھر میں پایا جانا ناممکنات میں سے ہے۔ پتا نہیں، یہ کم بخت کیسے گندم والے پڑھولے میں پہنچ گئی۔''

اس کی وضاحت میں بڑی معقولیت پائی جاتی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی باتوں پر غور کرنے پر پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کسی اور شخص نے خون آلود درانتی کو گندم والے پڑھولے میں چھپا دیا ہو اور وہ رفتہ رفتہ گندم کے ساتھ سرکتے ہوئے نیچے موکھلے تک پہنچ گئی ہو؟''

''ایسا نہیں ہوسکتا جناب!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

میں نے اس قطعیت پر حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں، بس ہم پانچوں ہی یہاں رہ رہے ہیں۔ ایسا کوئی بھی اس دوران میں ہمارے گھر میں نہیں آیا جس پر اس قسم کا شک کیا جاسکتا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ درانتی پہلے ہی سے گندم والے پڑھولے میں موجود تھی۔''

''پہلے!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلے کب سے؟''

''میرا مطلب ہے...... ہمارے اس گھر میں آنے سے پہلے۔''

ماسٹر جمیل کا بیان کسی سنسنی خیز انکشاف سے کم نہیں تھا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا اور تیز لہجے میں پوچھا۔

''ماسٹر صاحب! آپ کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس گھر میں آنے سے قبل آپ کہیں اور رہتے تھے؟''

''جی، تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے ہم لوگ چک نمبر بیالیس۔ ج ب میں رہتے تھے۔ ''چک بیالیس۔ ج ب'' موضع سوہدرہ کلاں سے لگ بھگ پانچ میل دور ہے۔ میں روزانہ سائیکل پر اسکول آتا جاتا تھا۔ اس آمدورفت میں اچھا خاصا وقت ضایع ہوجاتا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ سوہدرہ کلاں میں ایک گھر فروخت ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی گھر والی سے مشورہ کیا۔ وہ میری ہمنوا ثابت ہوئی لہٰذا اپنی آسانی اور سہولت کے لیے میں نے سوہدرہ کلاں میں گھر لے لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''آپ کو اس گھر میں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''کم وبیش دو ماہ ہوئے ہیں جناب!''

اس کے جواب نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونکا دیا۔ درانتی کے دندانے دار پھل پر جے سیاہی مائل خون کو دیکھ کر میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس درانتی کو خون آلود ہوئے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اب ماسٹر جمیل بتا رہا تھا کہ دو ماہ پہلے اس گھر میں کوئی اور رہائش پذیر تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے سوال کیا۔

''ماسٹر صاحب! آپ نے یہ گھر کس سے خریدا ہے؟''

''عنایت حسین سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے آپ سے پہلے اس گھر میں عنایت حسین رہتا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! کیا ان دو ماہ میں آپ نے گندم والے پڑھولے

میں خود کوئی گندم ڈالی تھی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔"اس گھر میں دو پڑھولے ہیں۔ ایک میں چاول اور دوسرے میں گندم کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ عنایت حسین نے یہ گھر میرے ہاتھ فروخت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ دونوں پڑھولے اناج سے بھرے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں کئی ماہ تک ان کو دوبارہ بھرنا نہیں پڑے گا۔ اس نے مہربانی کرتے ہوئے پڑھولوں میں موجود اناج کی مجھ سے قیمت بھی نہیں لی تھی۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو وہ کہنے لگا۔ دانہ پانی تو نصیب سے ہوتا ہے ماسٹر جی! یہاں کے دانے پانی نے آپ کو اس گھر تک پہنچایا ہے۔ میں آپ سے اس اناج کی قیمت وصول نہیں کروں گا۔"

بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔"لگتا ہے، عنایت حسین کی ساری مہربانی گندم والے پڑھولے میں بند تھی جو موکھلے میں سے درانتی کی شکل میں آپ نے باہر کھینچ نکالی ہے؟"

ماسٹر جمیل تشویش بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"تھانے دار صاحب! کیا آپ بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہیں جیسے خیالات میرے ذہن میں آرہے ہیں؟"

"آپ کیا سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟"

"میرا خیال ہے یہ خون آلود درانتی کسی واردات میں استعمال ہوئی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"میرے اندازے کے مطابق وہ واردات بڑی سنگین ہوگی...... کوئی قتل ایسی واردات!"

ماسٹر جمیل متفکر لہجے میں بولا۔"میرا خیال ہے، عنایت حسین اس خون آلود درانتی کے بارے میں ضرور جانتا ہوگا۔"

"ہوں!" میں نے گمبھیر انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور ماسٹر جمیل سے پوچھا۔"کیا عنایت حسین کی رہائش بھی ادھر سوہدرہ کلاں ہی میں ہے؟"

"نہیں جناب! وہ تو یہ گھر مجھے فروخت کر کے کہیں چلا گیا ہے۔" جمیل احمد نے جواب دیا۔

اس جواب سے سنسنی خیزی جھلکتی تھی۔ میں نے فوراً پوچھا۔"وہ کہاں گیا ہے؟"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں جناب!"

"کمال ہے۔" میں نے اُلجھن بھرے انداز میں کہا۔"آپ نے اس سے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ وہ سوہدرہ کلاں کو چھوڑ کر کہاں جارہا ہے؟"

"مجھے کیا پتا تھا جناب کہ بعد میں کوئی ایسی صورتِ حال پیش آجائے گی۔" وہ قدرے بیزاری سے بولا۔"میں اصل میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔ وہ گھر بیچنا چاہ رہا تھا اور مجھے گھر کی ضرورت تھی۔ ہمارے درمیان رقم کا معاملہ طے ہوا۔ میں نے ادائی کر دی اور اس نے اپنا گھر میرے حوالے کر دیا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!"

"ٹھیک ہے، میں بہت جلد پتا چلالوں گا کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں کو خیرباد کہہ کر کدھر گیا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔"فی الحال تو میں آپ کے گھر کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑے شوق سے جناب!" وہ بڑی رسان سے بولا۔"یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر جمیل احمد آف جماعت چہارم کے ہمراہ جائے وقوعہ کے معائنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ کانسٹیبل اللہ بخش بھی ہمارے ساتھ تھا۔

☆☆☆

ماسٹر جمیل کا گھر گاؤں کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ گاؤں کے اس حصے کی لوکیشن بڑی فطری، جاذبِ نظر اور پُرکشش تھی۔ گاؤں کے اختتام پر سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ انہی کھیتوں کے درمیان سے ایک نہر گزرتی تھی جس کا بہاؤ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت تھا۔ اس نہر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شرقاً غرباً ریلوے لائن تھی جس پر اِکا دُکا پسنجر ٹرینیں گزرتی تھیں یا پھر مال گاڑیوں کی آمدورفت دیکھنے کو ملتی تھی۔ ریلوے لائن سے آگے بھی تاحدِ نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا فرحت بخش سلسلہ نظر آتا تھا۔ ہم مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے مذکورہ مکان تک پہنچ گئے۔

وہ درمیانے سائز کا ایک کچا مکان تھا۔ جمیل احمد نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور "ابھی آتا ہوں" کا کہہ کر گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوگیا۔ بیٹھک کے طور پر استعمال ہونے والا وہ کمرا پیمائش میں بارہ ضرب پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ میں سرسری نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کانسٹیبل نے کہا۔"سر جی! لگتا ہے، ماسٹر صاحب ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کرنے اندر گئے ہیں۔"

کانسٹیبل کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا لیکن میں نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔''

''اِدھر میری بات ختم ہوئی اُدھر ماسٹر جمیل بیٹھک میں داخل ہوا اور اس نے کانسٹیبل کے ارمانوں پر برف سی چھڑک دی۔ خاطر تواضع کا ذکر کرتے ہوئے جیسے اللہ بخش کی باچھیں سی کھل گئی تھیں۔ وہ کھانے پینے کا شوقین ہونے سے کچھ بڑھ کر تھا۔ ایسے شخص کے لیے ''کھانے پینے کا لوبھی'' ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

ماسٹر جمیل احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے پردہ کرادیا ہے۔ آپ اندر آکر اس کمرے کا معائنہ کرسکتے ہیں جہاں اناج والے پڑھولے رکھے ہوئے ہیں۔''

اللہ بخش نے بے ساختہ ایک تھکی ہوئی گہری سانس خارج کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اللہ بخش! تم اِدھر ہی بیٹھو۔ میں اندر سے ہوکر آتا ہوں۔''

اس کے بعد میں ماسٹر جمیل کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک کشادہ صحن سے گزارنے کے بعد اس کمرے میں لے گیا جہاں اناج والے پڑھولے رکھے تھے۔ ماسٹر کے گھر میں آگے پیچھے چار کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور ان کے پہلو میں کشادہ صحن تھا۔ اس قطار کا پہلا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ اس کے بعد دو رہائشی کمرے تھے اور سب سے آخر میں پڑھولوں والا کمرا۔ ایک طرح سے اس کمرے کو اسٹور روم کہا جاسکتا تھا۔ وہاں پر متروک اور مستعمل دونوں قسم کی اشیا موجود تھیں۔ میں پڑھولوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس کمرے میں موجود پڑھولوں کی تعداد دو تھی جو پہلو بہ پہلو کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ استادہ تھے۔ ان دونوں کی جسامت اور قدبت ایک جیسا تھا۔ اُونچائی آٹھ فٹ کے قریب رہی ہوگی اور گولائی کا اندازہ میں نے ڈھائی فٹ کے آس پاس قائم کیا۔ ماسٹر جمیل نے ایک پڑھولے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! گندم والا پڑھولا یہی ہے۔ درانتی اسی پڑھولے میں سے نکلی ہے۔''

میں نے مذکورہ پڑھولے کی طرف بڑھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ کمرا اگرچہ گھر کے آخری سرے پر واقع تھا لیکن بیرونی سمت کھلنے والے ایک روشن دان سے اتنی روشنی اندر پہنچ رہی تھی کہ وہاں پر موجود ہر شے کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے گندم والے پڑھولے کے موکھلے کا جائزہ لیا۔ موکھلے کا ایک حصہ مجروح تھا۔ اس کے بارے میں مجھے ماسٹر جمیل نے تھانے ہی میں بتادیا تھا۔ خون آلود درانتی کو کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے اسے موکھلے کے ایک کنارے کو تھوڑا توڑنا پڑا تھا۔ میں موکھلے کے تنقیدی جائزے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ماسٹر جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ماسٹر صاحب! میں اس پڑھولے کے اوپر والے حصے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اوپر والے حصے سے میری مراد پڑھولے کی چھت تھی جہاں سے پڑھولے کے اندر اناج بھرا جاتا ہے۔ ماسٹر جمیل نے کہا۔ ''ٹھہریں جناب! میں چوکی لے کر آتا ہوں۔''

پڑھولے کی اونچائی آٹھ فٹ کے قریب تھی لہٰذا کسی چیز پر چڑھے بغیر اس کی چھت کا معائنہ ممکن نہیں تھا۔ دو منٹ کے بعد ماسٹر جمیل ایک چوبی چوکی لے کر واپس آگیا۔ مذکورہ چوکی کی اُونچائی لگ بھگ دو فٹ تھی۔ میں نے چوکی کو پڑھولے کے ساتھ لگادیا پھر اس پر کھڑے ہوکر پڑھولے کی چھت کا جائزہ لینے لگا۔

میرا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ دو فٹ چوکی کی اُونچائی اس میں شامل ہوئی تو میرا دائرۂ کار آٹھ فٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے پڑھولے کے اوپری حصے کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہاں مجھے کوئی بھی قابلِ گرفت شے نظر نہ آئی۔ اس سے اگلا مرحلہ پڑھولے کے اندر جھانکنے کا تھا مگر اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تھوڑا اور بلند ہونا ضروری تھا۔

میں نے چوکی پر کھڑے کھڑے ماسٹر جمیل سے پوچھا۔ ''کوئی اور چوکی مل جائے گی؟''

''ایک چھوٹی چوکی ہے گھر میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ ایک فٹ سے زیادہ اُونچی نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، تم وہ چوکی لے آؤ۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اس سے کام چل جائے گا۔''

اگر میں زمین سے مزید ایک فٹ بھی بلند ہوجاتا تو ڈھکنا اٹھا کر پڑھولے کے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر جمیل مذکورہ چوکی لے کر میرے پاس آگیا۔

ایک فٹی یہ چوکی پہلے والی چوکی سے رقبے اور پھیلاؤ میں کم و بیش آدھی تھی۔ میں نے بہ سہولت اسے دو فٹی چوکی پر جمایا اور احتیاط سے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں گندم والے پڑھولے کے اندر جھانک کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

اپنی تفتیشی کوشش سے مطمئن ہونے کے بعد میں نیچے اتر آیا اور ماسٹر جمیل سے کہا۔ ''کیا تم لوگ آج کل فاقہ کشی

کر رہے ہو؟"

"نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اللہ کے فضل سے ہم لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی رات ہم میں سے کوئی بھوکا سویا ہو۔"

"اچھا......!" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مگر ایسا نظر تو نہیں آ رہا۔"

وہ مزید اُلجھ گیا اور پوچھنے لگا۔ "آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں جناب؟"

"تم نے بتایا ہے کہ دو ماہ قبل جب تم لوگ آ کر اس گھر میں آباد ہوئے تو اناج والے یہ دونوں پڑھولے مکمل طور پر بھرے ہوئے تھے۔" میں نے اس کی اُلجھن دور کرنے کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے گندم والے پڑھولے کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ آدھے سے بھی زیادہ پڑھولا گندم سے بھرا ہوا ہے بلکہ یہ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اس پڑھولے سے ابھی چند سیر گندم ہی نکالی گئی ہے۔"

اس وضاحت سے وہ میرے مقصد کی تہ میں اتر گیا اور جلدی سے بولا۔ "تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میری گھر والی اور تینوں بچے چاول بہت شوق سے کھاتے ہیں لہٰذا ہمارے گھر میں گندم کی بہ نسبت چاول کا استعمال زیادہ ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

میں ماسٹر جمیل کی "اتنی سی بات" سے مطمئن ہوگیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ "ماسٹر صاحب! میں نے گندم والے پڑھولے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے لیکن میں اپنی تسلی کی خاطر ایک کام کروانا چاہتا ہوں اور وہ کام......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور ماسٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کام آپ کریں گے...... اپنی گھر والی کی مدد سے۔"

"جی بتائیں...... کیا کام ہے؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "آج اسکول سے تو آپ کی چھٹی ہو ہی چکی ہے۔ یہ دن آپ اپنے گھر میں گزاریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی گھر والی کی مدد سے دونوں پڑھولوں کے اناج کو باہر نکال لیں اور باریک بینی سے اناج کا جائزہ لیں۔ ممکن ہے، اس اناج میں سے کوئی ایسی شے برآمد ہو جائے جو خون آلود درانتی کی تفتیش کے سلسلے میں معاون ثابت ہو۔" میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن قانون کی مدد کرنا آپ پر بھی لازم ہے۔ اس تفتیشی کارروائی کے بعد آپ اناج کو اس کے مخصوص پڑھولے میں ڈال سکتے ہیں۔"

وہ فراخ دلی سے بولا۔ "زحمت والی کوئی بات نہیں جناب! آپ بے فکر ہو جائیں، میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کام کر ڈالوں گا۔"

"شاباش! مجھے آپ سے یہی اُمید تھی ماسٹر صاحب!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اور اگر اس اناج میں سے کوئی قابلِ ذکر شے برآمد ہو جائے تو آپ اسے لے کر فوراً میرے پاس تھانے آ جائیں گے۔"

"ضرور جناب!" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"اور اس تعمیل کے دوران میں آپ ایک احتیاط کو پیشِ نظر رکھیں گے۔"

میرے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ باری باری دونوں اناج کا جائزہ لیں گے۔ ایک اناج کو پڑھولے میں سے نکالنے کے بعد اس کا معائنہ کریں گے اور مطمئن ہونے کے بعد اسے واپس پڑھولے میں بھر دیں گے۔ تب جا کر آپ دوسرے پڑھولے کے ساتھ کارروائی شروع کریں گے۔ اگر آپ نے میری ہدایات پر من و عن عمل نہ کیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

وہ استعجابیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیسی گڑبڑ جناب؟"

"اگر دونوں اناج ایک ہی وقت میں پڑھولوں سے باہر نکالے گئے تو اس بات کے امکانات بہت قوی ہیں کہ وہ آپس میں مل جائیں گے۔" میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس "ملاپ" سے گڑبڑ یہ ہوگی کہ تمہارے بچے اور گھر والی تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ گندم ملے چاول انہیں پسند نہیں آئیں گے اور ان کی خفگی آپ کے گھر کے امن و امان کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

"اوہ......!" اس نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "جناب! آپ بڑا شائستہ مذاق کرتے ہیں۔"

میں اس کی معیت میں پڑھولوں والے کمرے سے نکل

کر صحن میں آ گیا۔
ماسٹر جمیل کے گھر میں ہمارا داخلہ بیٹھک کے بیرونی دروازے سے ہوا تھا۔ اب مجھے گھر کے اندرونی حصے کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ گھر کا مرکزی داخلی دروازہ ایک چھت دار برآمدے میں کھلتا تھا۔ اس برآمدے میں بیٹھک کا ایک دروازہ بھی کھلتا تھا جو گھر کے اندرونی حصے سے بیٹھک میں آمد و شد کا وسیلہ تھا۔ مذکورہ برآمدے سے آگے کشادہ صحن تھا۔ اسی صحن میں بیٹھک سے متصل کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ بعد کے دو کمروں میں جانے کے لیے کمرا در کمرا آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ صحن کے اختتام پر باورچی خانہ اور غسل خانہ پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک تنگ سا راستہ مکان کی عقبی سمت کو نکلتا تھا۔ اس راستے نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور میں اسی طرف بڑھ گیا۔
ماسٹر جمیل کے ہمراہ میں مذکورہ راستے سے گزر کر مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں میں نے ایک تنور لگا دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دیوار کے قریب جانوروں کے چارے والی بڑی سی چوبی کنڈلی رکھی نظر آئی۔ کنڈلی کے نزدیک زمین میں تین چار بڑے کھونٹے بھی گڑے دکھائی دے رہے تھے مگر وہاں جانور نام کی کوئی شے وجود نہیں رکھتی تھی۔ ایک کونے میں خشک لکڑیاں اور اُپلے بھی رکھے تھے جو یقیناً چولہے اور تنور میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔ میرے چہرے پر اُبھرنے والی اُلجھن کو ماسٹر جمیل نے فوراً بھانپ لیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔
''تھانے دار صاحب! یہ ساری جگہ بھی اس مکان ہی کا حصہ ہے۔'' پھر اس نے ایک دیوار کو تھپتھپاتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے پیچھے پڑھولوں والا کمرا ہے جہاں تھوڑی دیر پہلے آپ موجود تھے۔ دراصل اس جگہ کو عنایت حسین مویشیوں کی دیکھ ریکھ کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ مجھے مویشی پالنے کا شوق ہے اور نہ انہیں سنبھالنے کا طریقہ آتا ہے لہٰذا یہ جگہ آپ کو خالی دکھائی دے رہی ہے۔ البتہ......''
اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک طویل سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ اس تنور کی ہمیں ضرورت تھی اس لیے یہ ہمارے استعمال میں ہے۔''
میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور ایک مرتبہ پھر مکان کے اس عقبی حصے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ وہاں پر مجھے کوئی بھی اہم یا قابلِ گرفت چیز نظر نہ آئی لیکن پتا نہیں کیوں اس جگہ کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنے محسوسات کو کوئی نام نہ دے سکا چنانچہ سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔
میں ماسٹر جمیل کے ہمراہ واپس بیٹھک میں آ گیا۔ ہم بیٹھ چکے تو ماسٹر نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے کیا اندازہ قائم کیا ہے؟''
میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجایش نہیں کہ خون آلود درانتی کسی واردات میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے دندانے دار پھل پر جما ہوا خون کسی واردات ہی کی نشانی ہے۔ پھر جس پُراسرار انداز میں مذکورہ درانتی کو گندم والے پڑھولے میں چھپایا گیا ہے اس سے بھی جرم کی بو آتی ہے۔ بس......'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بات مکمل کر دی۔
''بس یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ واردات کب اور کہاں پیش آئی؟ ان سوالات کے درست جوابات تو عنایت حسین ہی دے سکتا ہے لیکن عنایت حسین کہاں ملے گا......؟'' میں نے ماسٹر جمیل کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''یہ آپ نہیں جانتے۔''
وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ عنایت حسین یہاں سے کہاں منتقل ہوا ہے تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔''
''کوئی بات نہیں ماسٹر صاحب! آپ ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔'' میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ کو نہیں پتا تو میں پتا چلا لوں گا۔ اس کے آس پڑوس والوں کو ضرور کچھ خبر ہوگی۔ ویسے......!''
میں نے سوچنے والے انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا اور ماسٹر جمیل کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے تکنے لگا۔ وہ میرے دیکھنے کے اس انداز سے اُلجھن آمیز بے چینی محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔
''ویسے میرا خیال ہے ماسٹر صاحب! کہ آپ کی گھر والی کو اس بارے میں کچھ سن گن ضرور ہوگی۔ عورتیں بہت جلد اپنا ڈاک خانہ ملا لیتی ہیں۔ ہوسکتا ہے اڑوس پڑوس والی عورتوں سے کچھ خبریں آپ کی بیوی تک بھی پہنچی ہوں۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''
وہ متانت سے بولا۔ ''میں آپ کے اندازے کی تردید نہیں کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کوثر سے بھی اس حوالے سے سوال نہیں کیا اور نہ ہی اس اللہ کی بندی نے ازخود مجھے کچھ بتایا ہے اور اس کی ایک وجہ بھی ہے......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، سانس درست کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے کبھی ایسی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ درانتی کی برآمد کے بعد ہی عنایت حسین کے بارے میں مختلف سوالات اٹھے ہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے کبھی ایسے استفسارات کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن اب تو ایسا موقع اور ضرورت پیدا ہو چکی ہے۔ آپ ذرا اپنی گھر والی کو ٹٹول کر تو دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔ ویسے یہاں سے اٹھنے کے بعد میں آپ کے پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ تو کروں گا ہی۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی اپنی گھر والی سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

اِدھر ماسٹر جمیل کا جملہ مکمل ہوا، اُدھر بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

ماسٹر جمیل نے چونک کر ہماری جانب دیکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مذکورہ دروازہ گھر کی اندرونی سمت یعنی چھتے ہوئے (چھت دار) برآمدے میں کھلتا تھا۔ اس وقت گھر میں ماسٹر جمیل کی بیوی اور تینوں بچے موجود تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ انہی چار افراد...... بلکہ تین افراد میں سے کوئی ایک ہوگا۔ ماسٹر جمیل کے سب سے چھوٹے بچے شفاعت کو میں نے اس لیے خارج از امکان رکھا تھا کہ مجھے اس کی عمر لگ بھگ دو سال بتائی گئی تھی اور...... دو سالہ بچہ اس انداز میں دستک دینے کے قابل نہیں ہوتا۔

ماسٹر نے باآہستگی دروازہ کھولا اور نیم وا دروازے کے سامنے آ گیا۔ میں دیکھ نہ سکا کہ ادھ کھلے دروازے کی دوسری طرف کون تھا۔ بہر حال، اگلے ہی لمحے وہ پلٹ آیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں مجھے ایک ٹرے نظر آئی جس میں چند برتن سجے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ ٹرے میں ہماری خاطر داری کا سامان آیا تھا۔

ماسٹر جمیل نے مذکورہ ٹرے کو ایک چھوٹی میز پر سجا کر ہمارے سامنے رکھ دیا پھر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''آپ لوگ شروع کریں۔ میں کوثر سے بات کر کے آتا ہوں۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی ماسٹر صاحب!'' کانسٹیبل اللہ بخش نے سرسری انداز میں کہا۔

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ کانسٹیبل نے یہ بات محض رسمِ دنیا نبھانے کے لیے کھوکھلے انداز میں کہی تھی ورنہ اس کے ذہن میں تو کچھ اس قسم کے خیالات تھے...... ماسٹر صاحب! ایسے نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔ آپ نے تو حد کر دی۔

ماسٹر جمیل جیسے ہی بیٹھک سے باہر نکلا، اللہ بخش بے صبری سے ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھ سے بولا ''ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ بخش! کیا تمہارے ذہن میں یہ خدشہ ہے کہ اگر ہم نے اس ٹرے میں سجے ہوئے لوازماتِ خورد و نوش پر ہاتھ صاف کرنے میں دیر کر دی تو ماسٹر جمیل یہ ٹرے اٹھا لے جائے گا؟''

وہ خجل سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ بات نہیں ہے ملک صاحب!''

اس نے اس کے ساتھ ہی تیزی سے ٹرے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو روک کر گھٹنوں پر رکھ لیا تو میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ بات نہیں تو پھر کون سی بات ہے؟''

''وہ جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، میں نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ جب رزق سامنے کھانے کے لیے تیار رکھا ہو تو اس کو انتظار نہیں کروانا چاہیے......!''

کانسٹیبل کی یہ بات انتہائی معقول اور برمحل تھی لہٰذا میں نے اس کے ندیدے پن کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد ہم مذکورہ ٹرے کی جانب ''متوجہ'' ہو گئے۔

ماسٹر جمیل کی گھر والی خاصی سگھڑ اور سلیقہ شعار عورت معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں اس نے ڈھیر ساری چیزیں تیار کر ڈالی تھیں جن میں...... ایک پلیٹ میں اُبلے ہوئے گرما گرم انڈے کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ ایک ڈونگے میں گاجر کا حلوا تھا۔ ایک پلیٹ میں تلی ہوئی مچھلی کے دو بڑے قتلے موجود تھے۔ ساتھ ہی چائے سے بھری ہوئی چائے دانی اور نیم گرم دودھ والے دو گلاس۔ موسم کی مناسبت سے یہ بھرپور خاطر تواضع تھی۔ ہم انعامِ خداوندی سے پوری طرح انصاف کرنے لگے۔

ماسٹر جمیل کوئی دس منٹ کے بعد دوبارہ بیٹھک میں نمودار ہوا۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس نے دانستہ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا تاکہ ہم اس کی غیر موجودی میں کسی قسم کا تکلف نہ برتیں۔ اس کا یہ عمل عقل مندی پر دلالت کرتا تھا۔ کانسٹیبل اللہ بخش کے بارے میں تو میں وثوق سے کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا البتہ ماسٹر جمیل کے سامنے ممکن ہے،

میں ایک کپ چائے سے آگے نہ بڑھتا۔
ماسٹر جمیل بڑے اطمینان سے آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔
میں نے اپنے ہاتھ کے "کام" کو نمٹایا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا البتہ کانسٹیبل اللہ بخش بڑی بے پروائی سے اپنے کام میں "جتا" رہا۔
"کچھ پتا چلا ماسٹر صاحب؟" میں نے ماسٹر جمیل سے استفسار کیا۔
وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔
"میری گھر والی عنایت حسین کے بارے میں جو کچھ جانتی ہے، ممکن ہے وہ معلومات آپ کے کسی کام کی نہ ہوں۔"
"یہ فیصلہ میں با آسانی کر لوں گا کہ کون سی بات مفید ثابت ہو سکتی ہے اور کون سی بے کار۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس، آپ شروع ہو جائیں۔"
اور...... وہ شروع ہو گیا۔
ماسٹر جمیل کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کی بیوی بھی زیادہ میل ملاقات رکھنے والی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کی عورتوں سے اسے عنایت حسین کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، اس کے مطابق...... اس گھر میں ماسٹر جمیل کی آمد سے قبل عنایت حسین اپنے بوڑھے باپ کرامت حسین کے ساتھ رہتا تھا۔ عنایت حسین شادی شدہ تھا لیکن بیوی کے ساتھ اس کی بنتی نہیں تھی۔ ان کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا اور اس کا سبب عنایت حسین کی بیوی ہی بتایا جاتا تھا۔ آس پڑوس کے مطابق شگفتہ ایک تیز طرّار اور لڑاکا عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر عنایت حسین کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ان میاں بیوی کے درمیان جب بھی جھگڑا ہوتا، شگفتہ روٹھ کر اپنے میکے چلی جاتی۔ چند روز اسی تناؤ میں گزر جاتے پھر عنایت حسین اپنی سسرال جاتا، شگفتہ کی منت خوشامد کرتا اور اسے منا کر واپس سوہدرہ کلاں لے آتا لیکن چند روز بعد ہی ان میں ایک مرتبہ پھر لڑائی ہو جاتی۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ شگفتہ مہینے میں اگر چار دن عنایت حسین کے پاس رہتی تھی تو چھبیس دن اس کے اپنے میکے میں گزرتے تھے۔ پڑوسیوں کا خیال تھا کہ شاید عنایت حسین سوہدرہ کلاں والا مکان اور زمین بیچ کر اپنی سسرال ہی میں جا بسا ہے۔ ماسٹر جمیل کی زبانی ایک بات یہ بھی پتا چلی کہ جن دنوں عنایت حسین کے ساتھ اس کا مکان کے حوالے سے سودا ہو رہا تھا جب بھی شگفتہ گھر میں کہیں نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس نے عنایت حسین کے باپ کو دیکھا تھا۔ اس کی جو بھی ایک دو ملاقاتیں ہوئیں وہ عنایت حسین ہی سے ہوئی تھیں۔
ماسٹر جمیل یہ کہانی سنانے کے بعد خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ بات تو میرے علم میں آ گئی تھی کہ دونوں میاں بیوی میں اکثر و بیشتر دنگا فساد ہوتا رہتا تھا لیکن اس لڑائی جھگڑے کی وجوہ کیا تھیں، یہ جاننا بہت ضروری تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ خوامخواہ جھگڑنے بیٹھ جاتے ہوں اور وہ بھی بلا مقصد ڈراما کر کے اپنے میکے چلی جاتی ہو۔ میرا دل کہہ رہا تھا، اگر میں عنایت حسین اور شگفتہ کے درمیان واقع تنازع کا سراغ لگا لوں تو اس کیس کو چٹکی بجاتے میں حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سارے معاملات آپس میں جڑے ہوئے نظر آتے تھے۔
"ماسٹر صاحب!" میں نے اسی خدشاتی سوال کے جواب کی خاطر پوچھا۔ "کیا آپ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عنایت حسین اور شگفتہ کے درمیان جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی؟"
اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں جناب! اس سلسلے میں کوئی حتمی اور ٹھوس بات سامنے نہیں آ سکی...... یا یہ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جو باتیں ابھی تک نامعلوم ہیں انہیں میں بہت جلد معلوم کر لوں گا۔ بہرحال، آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔"
وہ کسی معقول اور شریف النفس انسان کی طرح بولا۔
"یہ تو میرا فرض تھا تھانے دار صاحب!"
میں ماسٹر جمیل احمد کے گھر سے باہر نکل آیا۔
کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا۔ "ملک صاحب! اب کیا ارادہ ہے؟"
"میرا ارادہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں جواب دیا۔
"ہم تھانے جا رہے ہیں نا؟" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں، تھانے جانے میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک دو ضروری کام ابھی باقی ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"
وہ خاموشی سے میرے ہمراہ ہو لیا۔
عنایت حسین کا نام اس وقت میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کے بارے میں جب میری تحقیقات مکمل ہوں گی تو سنسنی خیز انکشافات کا انبار سا لگ جائے گا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ماسٹر جمیل جتنی

مرتبہ بھی عنایت حسین سے ملا، اسے اس گھر میں اور کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ شگفتہ کا روٹھ کر میکے میں جا بیٹھنا ایک معمول کی بات بن کر رہ گئی تھی لیکن اس روٹھنے کی وجہ ابھی تک سامنے نہیں آسکی تھی اور...... یہ وجہ معلوم کرنا انتہائی ضروری تھا۔

ماسٹر جمیل کے گھر کے دائیں جانب نیاز علی کا مکان تھا اور بائیں طرف غلام لوہار رہائش پذیر تھا۔ ماسٹر جمیل کی بیوی کوثر پروین نے تو تشفی آمیز معلومات فراہم نہیں کی تھیں مگر مجھے یقین تھا، اگر میں عنایت حسین کے ان دیرینہ پڑوسیوں کو ٹٹولوں تو ضرور کسی اہم اور مفید بات تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ان پڑوسیوں کو عنایت حسین کے خانگی حالات کا اچھی طرح علم ہوگا۔

میں نے پہلے نیاز علی کے گھر کا انتخاب کیا اور کانسٹیبل اللہ بخش سے کہا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ جب ہم ماسٹر کے گھر سے نکلے تھے تو ماسٹر جمیل بھی ہمارے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کر چکا تھا لہٰذا میں نے مصلحتاً اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی رہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ماسٹر جمیل کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ درانتی والے معاملے میں فی الحال اپنی زبان بند رکھے۔ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ اس کے گھر میں پولیس کیوں آئی تھی تو وہ کام چلانے کے لیے کوئی بھی خوبصورت بہانہ بنا سکتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت پر من وعن عمل کرے گا۔

دستک کے جواب میں گھر کے اندر قدموں کی مخصوص چاپ اُبھری اور کوئی دروازے تک آ کر رُک گیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اگلے ہی لمحے دروازہ کھل جائے گا لیکن جب میری توقع پوری نہیں ہوئی تو میں نے کانسٹیبل کو دوبارہ دستک کے لیے اشارہ کیا۔

کانسٹیبل کو دوسری دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے جیسے ہی دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا، دروازے کے عقب سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ اس آواز میں تشویش ناک استفسار پنہاں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ نیاز علی کی بیوی ہو سکتی تھی۔

"کون ہے؟" اندر موجود عورت نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میں نیاز علی سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ گھر میں ہے؟"

"نہیں جی...... نیاز تو اس وقت گھر میں نہیں۔"

"وہ کب تک واپس آ جائے گا؟"

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ اگر نیاز علی کو تھوڑی دیر بعد واپس آنا ہو تو میں پہلے غلام لوہار کا انٹرویو کر لوں۔ بعد میں نیاز علی سے بھی بات ہو جائے گی۔ اندر موجود عورت نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"آپ کون ہیں...... اور نیاز سے آپ کو کیا کام ہے؟"

میں نے دانستہ غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام غلام فرید ہے اور...... کام میں نیاز علی کو ہی بتاؤں گا۔ بتاؤ، وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آ جائے گا؟"

"نیاز کام پر گیا ہوا ہے اور شام ہی کو واپس آئے گا۔" اس عورت نے جواب دیا۔ "اُدھر بڑے بوڑھ (بڑھ کا درخت) کے پاس اس کا کولھو ہے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے کولھو پر کام کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اُدھر کولھو پر ہی اس سے مل لوں گا۔"

یہ کہتے ہی میں کانسٹیبل کے ساتھ غلام لوہار کے گھر کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ غلام لوہار کی دُکان گھر کے اندر ہی سامنے والے حصے میں موجود تھی لہٰذا اس سے فوری ملاقات ہو گئی۔ ہم اس کی دُکان میں داخل ہوئے تو وہ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اپنے اڈے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ہم دونوں پولیس کی مخصوص یونیفارم میں تھے اور اس کے اٹین شن ہونے کا سبب بھی یہی تھا۔

"آؤ جی...... بسم اللہ، بسم اللہ......!" وہ دونوں ہاتھ باندھ کر تعظیمی انداز میں بولا۔

غلام لوہار کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی مگر اس عمر میں بھی اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ لوہے کے ساتھ دن رات کھیلتے ہوئے وہ جیسے خود بھی لوہے ہی کا ہو گیا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا حامل ایک چاق چوبند شخص تھا۔ میں سرسری انداز میں اس کے لوہار خانے (دُکان) کا جائزہ لینے لگا۔

اگر آپ کا کسی لوہار کی دُکان (ورکشاپ) میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا، وہاں کیا کچھ پایا جاتا ہے۔ لوہار دراصل لوہے کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ وہ لوہے کا علاج کرتا ہے۔ لوہے ہی کے بنے ہوئے اوزاروں کی مدد سے وہ لوہے کے چھوٹے بڑے بے شکل ٹکڑوں کو اپنے فن اور ہنر کی مدد سے مخصوص شکل دے کر انہیں مفید اور قابلِ استعمال بناتا ہے۔ اس کام میں بھٹی اور وزنی ہتھوڑا اس کے سب سے بڑے معاون ہوتے ہیں۔ وہ لوہے کو آگ میں تپا کر اس کی سختی کو ختم کرتا ہے پھر ہتھوڑے کی ضربوں سے کوٹ پیٹ کر اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ کام اتنا

آسان نہیں جتنا کہ بیان میں نظر آتا ہے۔ ایک لوہار کو اپنے فن اور ہنر کے ساتھ ساتھ ہتھوڑے کے توسط سے بے پناہ جسمانی قوت کو بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم غلام لوہار کی دُکان میں داخل ہوئے تو وہ اپنے معمول کے کام میں مصروف تھا۔ دہکتی ہوئی بھٹی کے سبب کمرے میں بڑی خوشگوار سی حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا، لو بھائی! غلام لوہار تو بڑے مزے میں ہے۔ باہر ٹھنڈے ٹھار موسم نے جیسے ہر شے کو برف کا بنادیا ہے اور یہ اپنی دُکان کے اندر بڑے سکون سے بیٹھا کام کررہا ہے۔

اسے پُرسکون اور مطمئن دیکھ کر حسد یا رشک کرنے والوں کو ایک لمحے کے لیے یہ تصور بھی ضرور کرنا چاہیے کہ مئی، جون میں اس بے چارے پر کیا گزرتی ہوگی۔ جنوری، فروری کی بہ نسبت مئی، جون کا موسم بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہی ماحول جس میں ان دنوں برف جمی ہوئی تھی، مئی، جون میں آگ برساتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن سال کا کوئی بھی مہینا ہو، لوہار کی دُکان کا موسم تو ایک جیسا ہی رہتا ہے۔

میں نے دُکان کے ''معائنے'' کے بعد غلام لوہار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ چاچا! میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا، دیکھ لوں کہ تمہارا کام کاج کیسا چل رہا ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں؟''

ایک آسودۂ حال اور پریشان حال شخص میں سب سے نمایاں فرق دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ دونوں اپنی کیفیت کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے میرا مشاہدہ اور تجربہ ہر جگہ مطلق نہ ہو لیکن میں نے جو محسوس کیا وہی بتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں کسی خوش باش شخص کی بہ نسبت مصیبت زدہ شخص زیادہ متقی اور شکر گزار ہوتا ہے۔ اس سے جب بھی اس کا احوال دریافت کیا جائے تو وہ یہی جواب دیتا ہے...... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

غلام لوہار نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''مولا کا احسان ہے جی، مجھے کوئی فکر پریشانی نہیں۔ وہ جس حال میں بھی رکھے میں خوش ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ ٹھہریں جناب...... میں آپ کے لیے اندر سے کرسیاں لے کر آتا ہوں۔''

''کرسیوں کی کوئی ضرورت نہیں چاچا! ہم اِدھر چوکیوں پر ہی بیٹھ جائیں گے۔'' میں نے اس کی دُکان میں رکھی چوکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چوکی'' کو آپ پیڑا یا نیچا اسٹول سمجھ لیں۔ جو دُکانیں فرشی نشست پر مبنی ہوتی ہیں وہاں گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے ایسی چوکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں گاؤں دیہات کی دُکانداری عموماً فرشی نشست کی مرہون منت تھی۔ آج کل کافی تبدیلی دیکھنے میں آرہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے بدل جاتی ہے۔ بس گاؤں اور شہر کی زندگی میں رفتار کا فرق ہے۔ شہر میں ایک سال کے اندر جو تبدیلی رونما ہو جاتی ہے، گاؤں میں بعض اوقات اس تبدیلی کو آتے ہوئے پچاس سال بھی لگ جاتے ہیں۔

غلام لوہار نے دیوار پر ٹنگا ہوا ایک کپڑا اتارا اور جلدی سے ہمارے لیے دو چوکیوں کو صاف کردیا پھر عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''مائی باپ! آپ تشریف رکھیں۔ میں آپ کے لیے چائے پانی......!''

''ہم سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس تکلف کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے چند سوالات پوچھ کر چلا جاؤں گا۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور اُلجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! خیریت تو ہے نا؟''

شاید میں آپ سے یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ غلام لوہار کی دُکان میں قدم رکھتے ہی میں نے ملک صفدر حیات بطور تھانے دار اپنا تعارف کرادیا تھا جبھی وہ مجھے ''تھانے دار صاحب'' کہہ کر مخاطب کررہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بڑی رسان سے کہا۔

''اس بات کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے کہ خیریت ہے یا نہیں ہے۔ بہرحال، چاچا غلام! بتاؤ، تمہارا یہ نیا پڑوسی کیسا بندہ ہے؟''

میں نے دانستہ بات کو گھما کر گفتگو کا آغاز کیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ ماسٹر صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں نا؟''

''کیا کوئی اور بھی تمہارا نیا پڑوسی آباد ہوا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''دو ڈھائی ماہ پہلے ماسٹر صاحب ہی اس گھر میں آباد ہوئے ہیں۔'' وہ ماسٹر جمیل والے مکان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی تم سے اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟''

''ماسٹر صاحب تو بڑے بھلے مانس ہیں۔'' اس نے بتایا اور ایک مرتبہ پھر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر غلام لوہار کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ماسٹر جمیل سے پہلے اس گھر میں کون رہتا تھا؟''

''عنایت حسین اور اس کا بوڑھا باپ کرامت حسین۔'' غلام لوہار نے جواب دیا۔ ''عنایت یہ مکان ماسٹر صاحب کو بیچ کر خود اس گاؤں سے چلا گیا ہے۔''

''کہاں چلا گیا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا خیال ہے جہاں اس کی بیوی نے چاہا ہوگا وہ وہیں گیا ہوگا۔'' بات کرتے کرتے غلام لوہار کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ ''بڑی ہی کپتی (کمینی) عورت تھی جناب عنایت حسین کی گھر والی۔''

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ عنایت حسین کی جھگڑالو بیوی شگفتہ کے ''اوصاف'' بیان کر رہا تھا۔ وہ شگفتہ کی جانب سے خاصا برگشتہ اور خفا نظر آتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں اسے ڈھنگ سے کریدتا تو اس کی زبان سے بڑی کارآمد معلومات اُگلوائی جاسکتی تھیں لیکن کوئی اور سوال کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔

''چاچا!'' میں نے غلام لوہار کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تمہیں یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ عنایت حسین کی گھر والی اسے کہاں لے جانے کی خواہش مند تھی؟''

''اپنے میکے کے قریب...... اور کہاں!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر ٹوبہ ٹیک سنگھ والا میں شگفتہ کے ماں پیو رہتے ہیں۔''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تو اس کا مطلب ہے عنایت حسین یہ مکان فروخت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ والا گیا ہے؟''

غلام لوہار جلدی سے تصحیح کرنے والے انداز میں بولا۔ ''جناب! میں نے اپنے اندازے کی بات کی ہے ورنہ مجھے نہیں پتا وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ وہ تو جاتے وقت مل کر ہی نہیں گئے حالانکہ کرامت تو اکثر اِدھر میری دُکان پر بیٹھا گپ شپ کرتا رہتا تھا۔ یہ بڑا ہی مظلوم بڈھا ہے تھانے دار صاحب!''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''چاچا! تمہارا مطلب کیا ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! عنایت حسین کی بیوہ شگفتہ اپنے سسر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کرامت حسین میرے پاس بیٹھا اپنے دُکھڑے روتا رہتا تھا۔ بزرگوں کا گھر میں ایک احترام ہوتا ہے۔ عنایت حسین کے سامنے تو وہ وقت پر کرامت کو کھانا دے دیتی تھی لیکن اس کی غیر موجودگی میں شگفتہ کا اپنے سسر کے ساتھ رویہ بڑا ہی نامناسب تھا۔ بے چارے کرامت کی عمر ستر کے قریب ہے اور اس کی نگاہ بھی کافی کمزور ہو چکی ہے۔ کرامت نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا ہے کہ شگفتہ اس کے کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ وہ پہنے ہوئے کپڑے دھونے کے لیے اتارتا تو اگلے روز وہی میلے وہ اسے تھما دیتی اور بڑی ڈھٹائی سے کہتی کہ میں نے کپڑے اچھی طرح دھو دیے ہیں۔ کرامت حسین نے ایک واقعہ تو ایسا سنایا کہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔''

غلام لوہار نے تھوڑا توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کرامت نے مجھے بتایا کہ اکثر و بیشتر اس کی بہو اس کے سالن میں تھوڑا پانی ملا دیتی تھی جس کی وجہ سے اس سالن کا ذائقہ تو خراب ہوتا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی ظاہر ہے سالن میں نمک بھی کم ہو جاتا ہے۔ کرامت سالن میں نمک کی کمی کا اظہار کرتا تو نمک والا ڈبا اس کے سامنے رکھ دیا جاتا کہ جتنی ضرورت ہو، وہ اوپر سے نمک ڈال لے۔ ''اصلی سالن'' میں چونکہ نمک مرچ بالکل مناسب ہوتا تھا اس لیے عنایت چڑ کر اپنے باپ سے کہتا، ابا! آپ بڑھاپے میں بہت تیز نمک کھانے لگے ہو، مجھے تو سالن میں نمک بالکل ٹھیک لگ رہا ہے۔ اسی قسم کی کارروائی شگفتہ، کرامت کی چائے کے ساتھ بھی کرتی تھی۔ بڑے مزے کی بات ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''کرامت حسین کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی بہو کی ان چھل فریبیوں سے اچھی طرح واقف ہے مگر مصلحت کے تحت اس نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ وہ جانتا ہے عنایت اور شگفتہ میں پہلے ہی نہیں بنتی۔ اس نے اگر بہو پر تنقید شروع کر دی یا ''خانہ خراب'' سالن اور چائے کو ''ٹیسٹ'' کے لیے بیٹے کی طرف بڑھا دیا تو گھر میں ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ کرامت ایک امن پسند اور صلح جو شخص ہے اس لیے اس نے مصلحتاً اپنی زبان پر تالا ڈال رکھا ہے۔ آہ......!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر جیسے خیالوں میں گم ہوگیا۔ چند لمحے وہ جذب کی سی کیفیت میں خلا میں گھورتا رہا پھر ایک

ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کرامت یہاں تھا تو اس کے ساتھ میرا دل لگ گیا تھا۔ میری بڑی تمنا تھی کہ جاتے وقت میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا لیکن عنایت نے دو دن پہلے ہی اسے روانہ کردیا۔''

''کہاں روانہ کردیا؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے بیزاری سے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''یہی سوال میں نے عنایت سے اس وقت کیا تھا جب وہ اس گھر کو خیرباد کہہ کر جارہا تھا۔ عنایت نے مجھے بتایا کہ ابا کافی دنوں سے کوٹ فرمان جانے کی ضد کررہا تھا۔ میں نے اسے اُدھر ہی بھیج دیا ہے۔ اچھا ہے، وہ کچھ عرصہ کوٹ فرمان میں رہ لے، اس کا دل بہل جائے گا۔''

میں نے سرسری لہجے میں پوچھ لیا۔ ''کوٹ فرمان میں ان کا کون رہتا ہے؟''

''صغریٰ۔'' غلام لوہار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کرامت حسین کی دو ہی اولادیں ہیں صغریٰ اور عنایت۔ صغریٰ شادی شدہ ہے اور اُدھر کوٹ فرمان میں اپنے شوہر شکور کے ساتھ رہتی ہے۔ شکور وہاں کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ ان کے ماشاللہ پانچ بچے ہیں جبکہ......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''......جبکہ عنایت اولاد ایسی نعمت سے محروم ہے۔ صغریٰ، عنایت سے پانچ سال چھوٹی ہے اور باپ کو بڑا یاد کرتی رہتی ہے۔ صغریٰ کا گھر والا بھی کرامت کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے۔ کرامت اپنی گفتگو کے درمیان اکثر صغریٰ کے بچوں کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے وہ اپنے نواسا نواسیوں کو بہت چاہتا ہے۔ اچھا ہے، وہ کوٹ فرمان چلا گیا۔ وہاں اس کی خوب گزرے گی۔''

غلام لوہار کی زبانی شگفتہ، عنایت، کرامت، صغریٰ، شکور اور کوٹ فرمان کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں سرِدست میرے کام کی کوئی بات نہیں تھی۔ جس گھر میں بھی بوڑھے ساس سسر ہوں وہاں عموماً اسی قسم کی صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ عام طور پر یہی سننے میں آتا ہے کہ بہو کی ساس کی بہ نسبت اپنے سسر سے بن جاتی ہے لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں، ایک عمومی مشاہدہ ہے۔ اس چپقلش، ناچاقی اور اختلاف میں دونوں پارٹیوں کا تھوڑا بہت قصور ضرور ہوتا ہے، کسی کا کم اور کسی کا زیادہ۔ جب انسان ساٹھ کا ہندسہ عبور کرکے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیتا ہے تو اس کی عادت میں نمایاں تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ خاصا چڑچڑا اور تنقیدی ہوجاتا ہے۔ بات بات پر روک ٹوک اس کا وتیرہ بن جاتا ہے۔ اپنی دانست میں وہ عقل مندی کی باتیں کررہا ہوتا ہے لیکن نوجوانوں اور جوانوں کو یہ دانش مندانہ باتیں پسند نہیں آتیں لہٰذا وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ بیٹے بیٹیاں، نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں پھر بھی کچھ خیال کرلیتے ہیں لیکن بہو اور داماد سے اس قسم کی کوئی توقع رکھنے حماقت کے زمرے میں آتا ہے لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ یہ کوئی فارمولا نہیں، ایک عمومی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ بعض جگہ صورتِ حالات اس کے بالعکس بھی نظر آتی ہے۔ بہرحال، غلام لوہار سے جو مفید بات پتا چلی وہ یہ تھی کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں سے نکل کر ٹوبہ ٹہلی والا گیا ہوگا...... یا گیا تھا۔

ٹوبہ ٹہلی والا، موضع سوہدرہ کلاں سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع تھا جبکہ کوٹ فرمان جانے کے لیے سوہدرہ کلاں سے چھ میل شمال میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس کا مطلب تھا عنایت نے سرِدست اپنے باپ کو خود سے چودہ میل دور کردیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا وہ کرامت حسین سے بہت بیزار ہے۔ یہ بات الگ کہ اس کی اس بیزاری کے پیچھے شگفتہ کا دباؤ ہو۔

غلام لوہار کافی دیر سے میرے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ ہماری آمد سے قبل وہ اپنے کام میں جتا ہوا تھا لیکن ہمارے دُکان میں داخل ہوتے ہی اس نے کام سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ جب دہکتی ہوئی بھٹی پر سے اس کی توجہ ہٹی تو اس نے دھکنا موقوف کردیا۔ اسے دھونکنی کے ذریعے وہ ''حوصلہ اور تشفی'' نہیں مل رہی تھی جو اس کے دہکنے کے لیے ضروری تھی لہٰذا اس کی کارکردگی ''متاثر'' ہونے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے غلام لوہار کی دُکان میں جو خوشگوار اور فرحت بخش حرارت بھری ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی تھی۔ آمد اور جامد میں تناسب برقرار نہ رہے تو ایک روز قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔

میں نے غلام لوہار کی دُکان سے اٹھنے کا فیصلہ کرلیا اور جاتے جاتے اس سے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے اس مکان کے علاوہ عنایت حسین کی کچھ زمین اور مال مویشی بھی تھے۔ مکان تو اس نے ماسٹر جمیل کے ہاتھ فروخت کردیا۔ زمین اور مویشیوں کا کیا ہوا؟''

''عنایت کے پاس صرف پانچ ایکڑ اراضی تھی۔ وہ اسی زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا۔'' غلام لوہار نے مجھے بتایا۔ ''عنایت نے تو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا البتہ بعد میں مجھے پتا چلا ہے، زمین اس نے یہاں کے ایک زمیندار ملک صمد کو بیچ دی ہے اور ڈھور ڈنگر وہ اپنے ساتھ لے گیا

ہے۔''

پھر اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ عنایت حسین کے پاس ایک بھوری بھینس، ایک صحت مند گدھا اور دو بکریاں تھیں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری دیکھا دیکھی کانسٹیبل نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ غلام لوہار بھی تعظیماً کھڑا ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا! اب ہم چلتے ہیں۔''

وہ چند لمحات تک متذبذب نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ہچکچاہٹ بھرے انداز میں پوچھ بیٹھا۔ ''تھانے دار صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ عنایت کے بارے میں کس سلسلے میں پچھ پرتیت کر رہے ہیں؟''

غلام لوہار نے نہایت ہی سیدھا اور برمحل سوال کیا تھا۔ میں چاہتا تو اس کا جواب دے سکتا تھا لیکن فی الحال میں خون آلود درانتی والے معاملے کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا لہٰذا ایک خوبصورت بہانہ بناتے ہوئے اس سے کہا۔

''چاچا! میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ اوپر سے بڑے افسروں نے سختی سے آرڈر کیے ہیں کہ میں اپنے تھانے کی حدود میں آنے والے گاؤں دیہات کا خاص خیال رکھوں۔ میرے علاقے میں بسنے والوں کو کوئی تکلیف پریشانی نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ تعریفی انداز میں یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی افسرانِ بالا نے یہ احکام بھی صادر کیے ہیں کہ اگر میرے تھانے کی حدود میں کوئی شخص نقل مکانی کرتا ہے تو میں اس کی تفصیلی رپورٹ تیار کر کے اوپر والوں کو بھیج دوں۔ موضع سوہدرہ کلاں اور ٹوبہ ٹہلی والا میرے تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔ میں نے یہاں تو عنایت حسین کے بارے میں پوچھ گچھ کر لی ہے۔ اب اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا جا کر تحقیقات کرنا باقی ہیں۔'' اتنا کہہ کر میں رُکا پھر اچانک اس سے پوچھ لیا۔

''چاچا! تمہارا کوئی مسئلہ، کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

اس کے چہرے پر تشکرانہ تاثرات اُبھر آئے پھر جذبات سے لبریز آواز میں اس نے کہا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب! ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ اس علاقے میں کوئی آپ جیسا مخلص، ہمدرد، نیک سیرت اور خدا ترس تھانے دار تعینات ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہاں کوئی دُکھ، تکلیف یا پریشانی نہیں۔ اگر ایسا وقت آیا تو میں پہلی فرصت میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''ضرور...... ضرور......!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

ہم غلام لوہار کی دُکان سے باہر نکل آئے۔

کانسٹیبل اللہ بخش نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! یہ لوہار چاچا تو بڑا ہی بے وقوف اور سیدھا سادہ ہے۔''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''سیدھا سادہ تو وہ مجھے بھی لگا ہے لیکن تم اسے بے وقوف کس حوالے سے کہہ رہے ہو؟''

''اسے ذرا دنیا داری نہیں آتی۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری نظر میں دنیا داری کیا ہے اللہ بخش؟''

''دیکھیں نا ملک صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اسے کتنی بڑی پیشکش کی تھی کہ...... اسے کوئی تکلیف یا پریشانی تو نہیں؟ اس نے بڑی بے وقوفی سے جواب دیا اسے کوئی دُکھ تکلیف نہیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور سمجھ دار شخص ہوتا تو آپ کی اس فراخ دلانہ پیشکش سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ وہ آپ کے ذریعے اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلوا لیتا۔''

میں نے پورے تحمل سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اللہ بخش! اگر غلام لوہار تمہارے معیار کی سوجھ بوجھ اور دنیا داری کا مظاہرہ کرتا تو میری نظر میں بے وقوف قرار پاتا۔''

''یہ کیا بات ہوئی ملک صاحب؟'' اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''اللہ بخش! یہ سارا سمجھ کا ہیر پھیر ہے۔ غلام لوہار نے اس لیے مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی کہ اس کی زندگی میں واقعی کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں ہے اور یہ سب کچھ اس کی سادگی اور فطرت سے قریب زندگی گزارنے کا ثمر ہے۔ مجھے یقین ہے اس کی زندگی میں کبھی کوئی دُکھ تکلیف نہیں آئے گی۔ اس کے بالعکس......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس درست کی پھر سلسلۂ کلام کو تکمیل تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بالعکس اگر وہ ریاکاری اور غلط بیانی سے کام لیتا تو یہ حقیقت ہے، وہ وقتی طور پر مجھ سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن دروغ گوئی کو بنیاد بنا کر حاصل کیا گیا یہی فائدہ آگے چل کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ یاد رکھو...... جو لوگ حقیقت کو چھپا کر منافقت کی

زبان سے خود کو مجبور، بے کس اور مصیبت زدہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں وہ ناعاقبت اندیش لوگ کفرانِ نعمت کے علاوہ اپنی جانوں پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ قدرت ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتی اور ان کی زندگی واقعی نمونہ جہنم بن جاتی ہے۔"

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ اللہ بخش چند لمحات تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر تحیر آمیز آواز میں مستفسر ہوا۔

"ملک صاحب! آپ تھانے دار ہیں یا کوئی دینی مبلغ؟"

میں نے گمبھیرانہ انداز میں کہا۔ "اللہ بخش! میں سب سے پہلے ایک انسان ہوں، بعد میں تھانے دار۔ ایک انسان ہونے کے ناتے ہر شخص کو زندگی کی یہ حقیقی اُونچ نیچ معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انسان کا عالم دین یا مذہبی مبلغ ہونا ضروری نہیں۔"

اسی وقت آٹھ نو سال کا ایک بچہ ہمارے قریب آ گیا۔ اللہ بخش میری وضاحت کے جواب میں پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ بچے کی آمد پر اس کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ میں مذکورہ بچے کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"پولیس صاحب! آپ کو ماسی فردوس نے بلایا ہے۔"

"کون ماسی فردوس؟" میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

وہ اپنے عقب میں ایک گھر کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ماسی فردوس اس گھر میں رہتی ہے۔"

میں نے اس مکان کی طرف دیکھا جدھر اس بچے نے اشارہ کیا تھا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مذکورہ گھر نیاز علی کا تھا پھر بھی تصدیق کی خاطر میں نے اس بچے سے پوچھ لیا۔

"تم نیاز علی کے گھر کی بات کر رہے ہو نا؟"

"جی جی، وہی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ماسی فردوس، نیاز چاچا کی گھر والی ہے۔"

میں نے اُلجھن بھری نظر سے اللہ بخش کی طرف دیکھا پھر نیاز علی کے مکان کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اسی لمحے وہ بچہ ایک بغلی گلی میں غائب ہو گیا۔

نیاز علی کے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ فردوس نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ آخر اس عورت کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ غلام لوہار کی دُکان میں قدم رکھنے سے پہلے ہم نے نیاز علی کے مکان کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اور اس کی بیوی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ نیاز اس وقت اپنے کولھو پر ملے گا۔ میرا ذہن بار بار مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ فردوس کے پاس میرے لیے کوئی سنسنی خیز خبر ہو گی ورنہ وہ یوں بچہ بھیج کر مجھے اپنے پاس نہ بلاتی۔ نیاز علی کا مکان، ماسٹر جمیل کے گھر کی دائیں جانب واقع تھا۔

ہم نیاز علی کے گھر کے سامنے پہنچے تو داخلی دروازے کے عقب سے نسوانی آواز اُبھری۔ "تھانے دار صاحب! میں نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آپ اندر آ کر بیٹھ سکتے ہیں۔"

میں نے اس آواز کو پہچاننے میں ایک لمحے کی دیر نہ کی۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس آواز سے یہیں کھڑے ہو کر مختصر مکالمت کر چکا تھا۔ وہ یقیناً نیاز علی کی بیوی فردوس تھی۔

گھر کے داخلی دروازے کی بغل میں بیٹھک کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ دروازہ نیم وا تھا۔ میں کانسٹیبل اللہ بخش کے ساتھ اس دروازے کے توسط سے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اندر فردوس پہلے سے موجود تھی۔ وہ ہمیں بیٹھک کے دروازے کے بارے میں بتا کر اس طرف آ گئی تھی۔

فردوس کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہو گی۔ وہ قابلِ رشک صحت کی مالک ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر اس کی شخصیت کے حوالے سے ذہن میں کسی ہوتی چارپائی کا تصور اُبھرتا تھا۔ وہ ایک نڈر اور ٹھسے دار عورت تھی۔

ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اس وقت میں گھر میں اکیلی ہی ہوں۔ نیاز اپنے کولھو پر گیا ہے اور بچے پڑھنے کے لیے اسکول گئے ہیں۔ آپ لوگ بیٹھیں۔ میں آپ کے......"

"تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں فردوس بی بی!" میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے فوراً قطع کلامی کی۔ "ہم کسی شے کی طلب محسوس نہیں کر رہے۔ تم اِدھر ہی بیٹھ جاؤ اور بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟"

ایک لمحے کے تامل کے بعد وہ بھی بیٹھک میں بیٹھ گئی۔ میں مسلسل سوالیہ نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھوڑا توقف کیا پھر قدرے انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

"تھانے دار صاحب! آپ نے گھنٹا بھر پہلے غلام فرید کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ آپ میرے گھر والے سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا نیاز اس

وقت اپنے کولھو پر ہوگا تو آپ نے کہا آپ اُدھر کولھو پر جا کر ہی اس سے مل لیں گے پھر آپ غلام لوہار کی دُکان میں داخل ہوگئے۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی تو میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ یقیناً اس تیز طرار عورت نے چھپ کر دروازے کے عقب سے ہمیں دیکھا تھا۔ وہ میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے پیچھے سے آپ کو دیکھا تھا۔ پولیس کی وردی میں آپ دونوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میں دُھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے اپنے گھر کی چھت پر گئی تھی تو میں نے آپ دونوں کو ماسٹر جمیل کے ساتھ اس کے گھر کے عقبی حصے میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ میں اس بات پر حیران ہوئی کہ آپ نے مجھے اپنا نام غلام فرید کیوں بتایا۔ میں نے اتنی دیر میں اپنے طور پر یہ جان لیا ہے کہ آپ کا نام ملک صفدر حیات ہے اور آپ ہمارے علاقے کے تھانے دار ہیں۔''

وہ ہوشیار ہی نہیں، خاصی خطرناک عورت بھی تھی۔ پتا نہیں اس نے کون سے ذرائع استعمال کر کے میرے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی استفساری نظر کے جواب میں کچھ کہتا، وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔

''تھانے دار جی! اتنا تو میں بھی جانتی ہوں، پولیس بلا مقصد کہیں آتی جاتی نہیں۔ اللہ خیر کرے، آپ کس کیس کی تفتیش کرنے نکلے ہیں؟''

فردوس جیسی ہوشیار عورت کو چکر دینا آسان کام نہیں تھا لیکن ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا لہٰذا برقت مجھے ایک عمدہ قسم کا بہانہ سوجھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

''فردوس بی بی! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ کہیں پر بھی پولیس کی آمد بے سبب نہیں ہوتی۔ میں بھی ایک معاملے کی تفتیش کے سلسلے میں ان گلیوں کی خاک چھان رہا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''دراصل...... میں عنایت کی بیوی شگفتہ کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھا کر رہا ہوں۔''

وہ پھڑک اٹھی۔ ''کیسی معلومات تھانے دار صاحب؟''

میں نے اپنے جھوٹ کے منہ میں تکنیکی زبان فٹ کرتے ہوئے بات کو نبھا دیا۔ ''اُدھر ٹوبہ جھلی والا سے شگفتہ کی انکوائری آئی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق شگفتہ، عنایت حسین کی بیوی ہے۔ عنایت حسین، ماسٹر جمیل کے ہاتھ اپنا مکان بیچ کر کہیں چلا گیا ہے۔ اب پتا چلا ہے شگفتہ اُدھر ٹوبہ جھلی والا میں کسی مشتاق نامی آدمی سے شادی کر رہی ہے۔ میں اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے نکلا ہوں کہ آیا شگفتہ نے عنایت حسین سے طلاق حاصل کر لی ہے یا......؟''

میں نے بڑے پُراسرار انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو فردوس کے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی۔ جب وہ بولی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اندھیرے میں میرا چلایا ہوا تیر جا کر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

''آپ کہیں مہر مشتاق کی بات تو نہیں کر رہے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں، اس شخص کا نام مہر مشتاق ہی ہے۔''

''توبہ توبہ......!'' وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''غضب خدا کا۔ اس عورت کو تو ذرا بھی حیا نہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی بڈھا کرامت کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے کیونکہ بڈھے بارے مت ماری جاتی ہے انسان کی لیکن یہ معاملہ تو واقعی سچا نکلا۔''

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں آپ کو بالکل صحیح بتا رہی ہوں۔ عنایت حسین نے کبھی شگفتہ کو طلاق نہیں دی۔ وہ عنایت کی قانونی بیوی ہے۔ آپ قانون کی طاقت کا استعمال کریں اور پہلی فرصت میں اس شادی کو رُکوانے کی کوشش کریں۔ خصم پر خصم کرنا تو بہت بڑا گناہ ہے۔ پتا نہیں وہ بلّتی (نامراد) کون سا گل کھلانے جا رہی ہے۔''

یہ سچ ہے کہ انسان اگر خلوصِ نیت سے منزل کی تلاش میں نکلے اور اس کی کوشش میں بھی کوئی کلام نہ ہو تو اسے ضرور کامیابی ملتی ہے۔ میری اب تک کی کوشش اتفاق سے اچانک ہی رنگ لے آئی تھی۔ فردوس نے جوشِ جذبات میں مجھے اس کیس پر آگے بڑھنے کے لیے ایک راستہ فراہم کر دیا تھا لہٰذا میں نے اس کے اطمینان اور تسلی کی خاطر مضبوط لہجے میں کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں وہ شادی ہونے دوں۔ تم نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا کر قانون کی مدد کی ہے۔ میں تم سے تھوڑے سے اور تعاون کی اُمید رکھتا ہوں۔''

''جی جی...... بتائیں۔'' وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''فردوس بی بی! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ عنایت کا باپ کرامت، شگفتہ کے حوالے سے کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا، یہ کیا قصہ ہے؟''

وہ بڑی رسان سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''قصہ یہ ہے جناب کہ شگفتہ نے یہ وتیرہ اپنالیا تھا کہ آئے دن وہ اپنے خصم سے روٹھ کر اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا اپنے میکے چلی جاتی تھی۔ بڈھا کرامت اپنی بہو کی اس روش سے گہری تشویش میں مبتلا تھا۔ اسے شک ہوگیا کہ وہاں شگفتہ کا ''کسی'' سے کوئی چکر ہے۔ کچھ عرصے کے بعد کرامت حسین نے ''کسی'' کی جگہ مشتاق مہر کا نام فٹ کردیا۔ جب شگفتہ کا روٹھنا اور میکے میں جابیٹھنا حد سے گزر گیا تو کرامت نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے بیٹے سے اس سلسلے میں بات کی۔ عنایت نے مبہم انداز میں اپنی بیوی سے بازپرس کی تو اس نے ایک طوفان کھڑا کردیا پھر تو وہ ایک لمبے عرصے کے لیے میکے جابیٹھی۔''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، یہ عنایت حسین کس بودی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو زندہ گاڑ دیتا...... یا ٹکڑے کرکے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ بیوی کی ایسی حرکتیں تو کوئی بے غیرت مرد ہی برداشت کرسکتا ہے...... یا پھر کوئی ایسا شخص جو مرد کہلانے کے قابل نہ ہو۔''

آخری جملے اس نے بڑے زہریلے انداز میں ادا کیے تھے۔ اس کے الفاظ سے ترشی ٹپکتی تھی۔ وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ کافی حقیقت پسند بھی تھی۔ دلچسپ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے بڑے مخصوص منفی انداز میں سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور تلخی سے بولی۔

''شگفتہ کو روٹھ کر اپنے میکے بیٹھے چند روز ہی گزرتے تھے کہ عنایت منت خوشامد کے لیے ٹوبہ ٹہلی والا پہنچ جاتا۔ کچھ دن اس کی خوشامد درآمد میں گزارتا اور اسے منا کر یہاں لانے میں کامیاب ہوجاتا۔ وہ ہفتہ دس دن یہاں رُکتی پھر کسی بے بنیاد بات پر جھگڑے کی عمارت کھڑی کرکے اپنے میکے چلی جاتی۔ ان دنوں بھی وہ ٹوبہ ٹہلی والا گئی ہوئی تھی جب عنایت اپنا مکان بیچ کر گیا ہے۔''

فردوس کی زبانی عنایت اینڈ کمپنی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ میں نے اس تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اٹھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

''سننے میں آرہا ہے، عنایت حسین یہاں کی زمین اور مکان بیچ کر اپنی سسرال ٹوبہ ٹہلی والا گیا ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے، وہ اُدھر نہیں گیا ہوگا'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر عنایت ٹوبہ ٹہلی والا میں موجود ہوگا تو پھر شگفتہ، مہر مشتاق سے شادی نہیں کرسکے گی۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''میں بہت جلد ٹوبہ ٹہلی والا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں پھر ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ ویسے یہ مشتاق ہے کون؟'' بات کے اختتام پر میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

''کوئی غیر تھوڑی ہے۔'' وہ بڑی ادا سے ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''مہر مشتاق، شگفتہ کے چاچے کا بیٹا ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' میں معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے بولی۔ ''جی ہاں، تھانے دار صاحب!''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے رضاکارانہ تعاون کا شکریہ ادا کیا اور کانسٹیبل اللہ بخش کے ساتھ نیاز علی کے گھر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اے ایس آئی بشارت مرزا کو اپنے ساتھ لیا اور موضع ٹوبہ ٹہلی والا روانہ ہوگیا۔ جب تک عنایت حسین یا اس کی بیوی شگفتہ سے میری ملاقات نہ ہوجاتی، اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ رات بھر میرا ذہن اسی مسئلے کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہا تھا اور میں دو تین گھنٹے سے زیادہ کی نیند نہیں لے سکا تھا۔ اس کم خوابی کے اثرات مجھے اپنے اعصاب پر محسوس ہورہے تھے لیکن بہرحال، یہ تو فرائضِ منصبی کا حصہ اور تقاضا ہے۔

رات کو سوچنے کے دوران میں خون آلود دندانے دار درانتی پر میرا فوکس رہا تھا۔ وہ درانتی بہ زبانِ خاموشی یہ اعلان کرتی سنائی دیتی تھی کہ اس کی مدد سے کوئی خونی واردات عمل میں لائی گئی ہے...... کوئی وارداتِ قتل!

اس رُخ پر سوچتے ہوئے فردوس کے کہے ہوئے الفاظ اچانک میرے ذہن میں جلنے بجھنے لگے۔ اس نے بڑی تلخی سے کہا تھا...... اگر عنایت کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو زندہ گاڑ دیتا...... یا ٹکڑے کرکے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ کسی کو زمین میں گاڑا جائے یا ٹکڑے کرکے بھوکے

کتوں کے سامنے پھینک دیا جائے، بات ایک ہی ہے یعنی......قتل!

تو کیا......عنایت حسین کی غیرت اچانک جاگ اٹھی تھی اور اس نے واقعی اپنی بے راہ روی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟

یہ ایسا سنسنی خیز اور خطرناک سوال تھا کہ مجھے اپنے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی خون آلود درانتی کا معماحل بھی حل ہوتا نظر آنے لگا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ عنایت نے اس درانتی کی مدد سے اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالا ہو اور ازاں بعد آلۂ قتل کو گندم والے بڑھولے میں چھپا دیا ہو۔ ان امکانی باتوں کی تصدیق یا تردید تو بہ ٹہلی والا پہنچ کر ہی ہوسکتی تھی۔ اگر عنایت حسین نے واقعی اپنی بیوی کو قتل کیا تھا تو پھر شگفتہ کو تو بہ ٹہلی والا میں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مگر وہ......وہاں موجود تھی۔

ہم دوپہر کے وقت تو بہ ٹہلی والا پہنچے اور پوچھتے پاچھتے سیدھے شگفتہ کے میکے پہنچ گئے۔ یہ گھر گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ شگفتہ کے باپ یعقوب علی کا عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ وہ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ تھی اور اتفاق یہ تھا کہ اس وقت ان دونوں کے سوا گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ شگفتہ کی ماں کا نام شرافت بی بی معلوم ہوا۔

ہماری دستک کے جواب میں دروازہ شرافت بی بی ہی نے کھولا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں موضع سوہدرہ کلاں سے آیا ہوں اور اس کے جوائی (داماد) عنایت حسین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں تو وہ ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گئی۔ پولیس کی وردی کا اپنا ایک رعب داب ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بہت سے بند دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

شرافت بی بی نے ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد کہا۔ ''آپ لوگ اتنی دور سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔ میں شگفتہ سے کہتی ہوں آپ کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرے۔''

وہ اتنے نارمل انداز میں بات کر رہی تھی جیسے کہیں کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ پتا نہیں یہ اس کے حقیقی تاثرات تھے یا وہ کمال کی اداکارہ تھی۔ بہرحال، خط و خال سے وہ خاصی سرد و گرم چشیدہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا اس کے دل کا حال جاننے کے لیے مجھے سخت محنت کرنا پڑے گی۔

اس کی پُرکشش پیشکش کے جواب میں، میں نے کہا۔

''کسی قسم کے تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں، ہم تھانے سے ناشتا کر کے نکلے تھے۔''

''تھانے دار صاحب! سوہدرہ کلاں یہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''آپ لوگ گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ سردی کے موسم میں ویسے بھی جسم کو زیادہ گرمی (توانائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبح کا کھایا پیا تو سب برابر ہوگیا ہوگا۔''

اس نے بڑی معقول بات کی تھی لہٰذا اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ واقعی اس وقت مجھے ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہو رہی تھیں۔ ازیں علاوہ پوچھ تاچھ کے سلسلے میں ہمیں وہاں تھوڑا وقت گزارنا تھا چنانچہ خاطر تواضع کرانے میں کوئی مضایقہ نہیں تھا۔

مجھے نیم رضامند دیکھتے ہوئے شرافت بی بی گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئی۔ میں اس بیٹھک اور بیٹھک میں موجود ساز و سامان کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا اس گھر کے مالی حالات خاصے اچھے تھے یعنی وہاں کسی قسم کی کوئی معاشی پریشانی نہیں تھی۔ ان لوگوں کی زندگی بڑے اچھے اور خوشگوار انداز میں گزر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد شرافت بی بی واپس بیٹھک میں آگئی۔ وہ خالی ہاتھ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا اس نے ہماری خاطر داری کے لیے اپنی بیٹی شگفتہ کو ''آرڈر'' دے دیا تھا۔ شرافت بی بی میرے سامنے ایک موڑھے پر براجمان ہوگئی پھر بڑے تیکھے لہجے میں بولی۔

''لگتا ہے اس مرتبہ عنایت نے شگفتہ کو بلانے کے لیے باقاعدہ پولیس کی مدد لی ہے۔''

اس کے اس طنزیہ جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا، عنایت کے تازہ ترین حالات کی ان کو کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ بڑی اچنبھک صورتِ حال تھی۔ میں نے اسے گھسنے کے لیے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے شرافت بی بی! تم نے ''تنگ آمد، بہ جنگ آمد'' کے بارے میں تو سنا ہوگا؟''

''اچھا تو آپ یہاں......عنایت کے لیے جنگ کرنے آئے ہیں۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''لیکن شروع میں تو آپ نے بتایا تھا آپ عنایت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں؟''

''سچی بات تو یہی ہے۔'' میں نے گفتگو کو ٹو دی پوائنٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عنایت حسین کہاں ہے؟''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسے کہاں ہونا ہے...... اُدھر سوہدرہ کلاں میں اپنے گھر ہی میں ہوگا۔''

شرافت بی بی کے اس جملے نے مجھے بڑے واضح طور پر بتادیا کہ وہ عنایت کے مکان کی فروخت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں چند لمحات تک ٹٹولنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شرافت بی بی! دو ڈھائی ماہ پہلے تک تو وہ سوہدرہ کلاں ہی میں تھا لیکن پھر اس نے اپنا مکان اور زمین فروخت کردی۔ مال مویشیوں کو ساتھ لیا اور کہیں چلا گیا۔ اس کے باپ کرامت حسین کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس کوٹ فرمان چلا گیا ہے اور عنایت حسین کے حوالے سے یہی سننے میں آرہا ہے کہ وہ یہاں ٹوبہ ٹہلی والا آگیا ہے...... اسی لیے اس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا ہوں۔''

اس نے حیرت، دلچسپی اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری بات سنی پھر اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! یہ تو آپ بڑی عجیب کہانی سنا رہے ہیں۔ ہمیں ان واقعات کا بالکل کوئی علم نہیں۔ عنایت یہاں تو نہیں آیا۔''

''وہ آخری مرتبہ اس گھر میں کب آیا تھا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

اس سے پہلے کہ شرافت بی بی میرے سوال کا جواب دیتی، بیٹھک کے اندرونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شرافت بی بی نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور دروازے کی طرف منہ کر کے بہ آواز بلند کہا۔

''آجاؤ بیٹی...... خیر ہی ہے۔''

اگلے ہی لمحے ''بیٹی'' ایک ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ وہ یقیناً شگفتہ ہی تھی۔ شرافت بی بی نے اس کا تعارف کرا کر میرے اندازے کی تصدیق بھی کردی۔ میں نے جائزہ نظر سے شگفتہ کو دیکھا۔ وہ ایک گوری چٹی اور حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کے خط و خال میں ایک خاص قسم کا تناسب پایا جاتا تھا جس نے اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ وہ جاذبِ نظر دلکشی کی مالک تھی۔ اس کے سراپا میں وہ سب کچھ شامل تھا جو کسی بھی مرد کو مسخر اور مسحور کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ اسم بامسمیٰ کی ایک زندہ مثال تھی۔ یہ بات بخوبی میری سمجھ میں بیٹھ گئی کہ عنایت حسین اپنی بیوی کا گرویدہ کیوں تھا...... اور وہ کیوں روٹھی ہوئی بیوی کو بار بار منانے کے لیے ٹوبہ ٹہلی والا پہنچ جاتا تھا؟

اس دوران میں شرافت بی بی نے ایک چھوٹی میز ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ شگفتہ نے اپنے ہاتھوں میں سجائی ہوئی ٹرے کو باآہستگی اس میز پر رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شرافت بی بی نے کہا۔

''شگفتہ! تم بھی اِدھر ہی بیٹھو۔ میں چاہتی ہوں تمہاری موجودگی میں تھانے دار صاحب سے بات ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ عنایت کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے آئے ہیں۔''

شگفتہ اپنی ماں کے نزدیک دوسرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

شرافت نے ٹرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے مہمان نواز لہجے میں کہا۔ ''بسم اللہ کریں جناب!''

میں نے ٹرے میں موجود لوازماتِ خوردونوش کا جائزہ لیا۔ شیشے کے ایک جگ میں گرم دودھ نظر آرہا تھا اور اس کے ساتھ تانبے کے دو کنگ سائز گلاس رکھے تھے۔ ازیں علاوہ ٹرے میں دو پلیٹیں بھی موجود تھیں۔ ایک میں گرما گرم میوے والا سوجی کا حلوا تھا اور دوسری میں اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پیتل کی دو کٹوریوں میں پسا ہوا نمک اور کالی مرچ موجود تھی۔ ناشتے کی یہ ٹرے موسمِ سرما کا بڑا شافی ''علاج'' تھی۔

میں نے ''بسم اللہ'' کرتے ہوئے شرافت بی بی سے کہا۔ ''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا...... آخری مرتبہ عنایت اس گھر میں کب آیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے وہ تین ماہ پہلے یہاں آیا تھا۔'' پھر اس نے شگفتہ کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا بیٹی؟''

''نہیں اماں!'' شگفتہ نے فوراً تصدیق کردی۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔''

اس کے بعد شرافت بی بی نے شگفتہ کو عنایت کے مکان اور زمین فروخت کرنے کے بارے میں مختصراً بتایا اور یہ بھی کہ کرامت حسین کوٹ فرمان چلا گیا ہے۔ شگفتہ نے بھی تعجب سے یہ روداد سنی اور اس دوران میں وہ حیرت سے پلکیں جھپکتی رہی۔ آخر میں شرافت نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہم اس باپ بیٹے سے سخت تنگ ہیں۔ کیا آپ کے قانون میں انہیں سدھارنے کے لیے کوئی دفعہ موجود نہیں...... وہ اگر نہیں سدھر سکتے، نہ سدھریں لیکن ہماری جان تو چھوڑ دیں۔ آپ یقین کریں، میں شگفتہ کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔''

اب تک اس کیس کے کرداروں کی جو کہانی میرے علم میں آئی تھی، شرافت بی بی اس کے بالعکس صورتِ حال پیش کر رہی تھی۔ میں نے سوچا، اس سے کھل کر بات کرلوں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوسکے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ان دونوں کو اپنی معلومات سے آگاہ کیا تو شرافت بی بی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''توبہ......توبہ......تھانے دار صاحب! لوگوں کو جھوٹ بولتے ہوئے یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے۔ وہاں کوئی کسی کا نہیں ہوگا۔ صرف اپنے اعمال ہی کام آئیں گے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری بیٹی نے جتنا برداشت کیا ہے شاید ہی کوئی دوسری لڑکی اتنی ہمت کرسکے۔ عنایت کے ساتھ ساتھ اس نے اس اندھے کرامت کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اس خرابی کی اصل جڑ وہ خبیث بڈھا ہے۔ کرامت کسی شیطان سے کم نہیں تھانے دار صاحب۔ اگر شگفتہ کی ساس نہیں تو کیا ہوا، ایک کرامت سو ساسوں پر بھاری ہے۔ اس نے اپنی حرکتوں اور کمینگیوں سے شگفتہ کو کون کون سی اذیت نہیں دی۔ اس کے کردار پر حملے کیے گئے۔ اس مردود کرامت نے الزام لگایا کہ شگفتہ بدچلن ہے۔ اُدھر میکے میں اس کا کوئی یار بستا ہے اسی لیے خصم کے گھر میں اس کا دل نہیں لگتا۔ وہ بہانہ بے بہانہ ناراض ہوکر توبہ ٹھیلی والا آجاتی ہے......''

وہ جذبات کی رو میں طوفانی رفتار سے بولتی چلی گئی۔ ''عنایت دل کا زیادہ برا نہیں ہے لیکن وہ کرامت کی مٹھی میں بند ہے۔ جب بھی کوئی فتنہ اٹھا، کوئی جھگڑا ہوا، اس نے اپنے باپ کا ساتھ دیا۔ عورت ذات کہاں تک مقابلہ کرے گی جناب! جب پانی سر سے گزرنے لگتا تو شگفتہ میرے پاس آجاتی۔ برے وقت میں اولاد کے لیے ماں ہی سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ اگر شگفتہ کا باپ زندہ ہوتا تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات تک وہ گردن جھکا کر خاموش بیٹھی رہی پھر دوبارہ گویا ہوئی۔

''شگفتہ جب بھی روٹھ کر میکے بیٹھی، چند دن کے بعد ہی عنایت اسے منانے آجاتا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ عنایت، شگفتہ کو چاہتا ہے لیکن ایسی چاہت کو کیا کسی کھوہ (کنویں) میں ڈالنا ہے جس کے بدلے لات جوتے ملیں...... اور بدنامی رسوائی حصے میں آئے۔ عنایت تو ایک طرح سے اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن جب تک کرامت اس کے ساتھ نتھی تھا، شگفتہ کے لیے حالات ٹھیک نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے جب بھی سمجھا بجھا کر شگفتہ کو عنایت کے ساتھ روانہ کیا تو بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ آخری موقع ہے۔ وہ اپنے گھر کے ماحول کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے ورنہ اب کی بار اگر شگفتہ ٹوبہ ٹھیلی والا آگئی تو پھر کبھی سوہدرہ کلاں نہیں جائے گی۔ وہ ہر مرتبہ وعدہ کرتا کہ اب کوئی بدمزگی نہیں ہوگی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شگفتہ روتی دھوتی پھر میرے پاس پہنچ جاتی۔''

شرافت بی بی اپنے دُکھوں کو الفاظ کے روپ میں ڈھالنے کے دوران میں ذرا دیر کے لیے رُکی، ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، عنایت تین ماہ پہلے شگفتہ کو لینے ہمارے گھر آیا تھا۔ اس بار میں نے اس کی منت خوشامد کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے ہر وعدے کو رد کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا، جب تک اس گھر میں کرامت حسین موجود ہے، میری بیٹی وہاں نہیں جائے گی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، میں اپنے ابا کو کہاں بھیج دوں؟ میں نے حتمی انداز میں جواب دیا، یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ تم اگر شگفتہ کو الگ گھر میں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ بھول جاؤ اسے۔ وہ میری خوشامد کرتے ہوئے کہنے لگا، میں شگفتہ کو نہیں بھول سکتا۔ میں نے کہا، اگر تمہیں شگفتہ کی اتنی ہی ضرورت ہے تو پھر اس کے لیے رہائش کا الگ انتظام کرو۔ یہ بات لکھ لو کہ شگفتہ کسی ایسے گھر میں قدم بھی نہیں رکھے گی جہاں کرامت حسین موجود ہو۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس سوچ میں فکر اور پریشانی بھی شامل تھی۔ میں نے اسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور میں اس معاملے میں خود کو حق بجانب بھی سمجھتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد عنایت نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، ٹھیک ہے۔ میں جارہا ہوں۔ میں اس وقت تک شگفتہ کو لینے نہیں آؤں گا جب تک ابا کا کوئی مناسب بندوبست نہ کرلوں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں منتظر نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب!'' ایک لمحے کے وقفے سے وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''وہ دن اور آج کا دن، میں اور شگفتہ اس کی راہ دیکھ رہی ہیں کہ وہ کب اس منحوس کرامت کا بندوبست کرکے واپس آتا ہے۔ وہ تو نہیں آیا لیکن آپ اس کے حوالے سے ایک عجیب وغریب کہانی لے کر آگئے ہیں۔''

میں نے شرافت بی بی کی بات پوری توجہ سے سنی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس گفتگو کے دوران میں شگفتہ بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تائیدی اور تصدیقی لقمے دیتی رہی تھی۔ اس وقت کیس کی جو صورتِ حال اُبھر کر سامنے آئی تھی اس میں بہت کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ مؤقف اور بیان میں دونوں پارٹیوں کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جب تک دونوں فریق روبرو نہیں بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے اعتراضات کی وضاحت یا توجیہہ پیش نہیں کریں گے، ان کے مسئلے کا کوئی حل نکالا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کے مابین کسی قسم کے تصفیے کے امکان ہیں۔ ایک فریق یعنی شگفتہ اینڈ کمپنی تو میرے پاس تھا۔ اب مجھے دوسرے فریق عنایت اینڈ کمپنی کو تلاش کرنا تھا۔ عنایت حسین کی بازیابی اس لیے بھی ضروری تھی کہ اس کے حوالے سے ایک خون آلود درانتی بھی اس معاملے میں پیش پیش تھی۔

لگے ہاتھوں میں نے شرافت بی بی سے پوچھ لیا۔ ''یہ مہر مشتاق کا کیا معاملہ ہے؟''

''اس کے حوالے سے شگفتہ کے بارے میں جو افواہیں اُڑائی جارہی ہیں ان میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں۔'' وہ میرے سوال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''مشتاق میرے دیور کا بیٹا ہے۔ بہت ہی لائق اور بابا بچہ ہے۔ اگر آج عنایت، شگفتہ کو فارغ کردے تو میں مشتاق کو شگفتہ سے شادی پر تیار کرسکتی ہوں۔''

اس نے لفظ ''فارغ'' پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا جس کا واضح مطلب ''طلاق'' تھا۔ اپنے بارے میں اس نوعیت کی گفتگو سنتے ہی شگفتہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ہم دونوں ''ٹرے'' کو فارغ کرچکے تھے۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹے اور بیٹھک سے نکل گئی۔

میں نے شرافت بی بی سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے مشتاق، شگفتہ کو پسند کرتا ہے؟''

''میری شگفتہ ہے ہی ایسی کہ کوئی اس رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔

اس کے فخر میں کسی قسم کی ملاوٹ یا مبالغہ نہیں تھا۔ اپنی بیٹی کے بارے میں اس کا فتویٰ سو فیصد درست اور مبنی بر سچ تھا۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھ لیا۔

''کیا شگفتہ اس نئے رشتے کے لیے تیار ہوجائے گی؟''

''میرا خیال ہے، وہ انکار نہیں کرے گی۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔ ''میں نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے چیک کیا ہے۔ پھر اپنے مشتاق میں کوئی عیب فعل بھی نہیں۔ بس عنایت حسین کا کانٹا نکل جائے تو میں اس نیک کام میں ذرا بھی دیر نہ کروں۔''

وہ لمحے بھر کو رُکی پھر خاصے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اب اگر عنایت یہاں آیا نا..... تو میں اس سے یہی مطالبہ کروں گی کہ وہ شگفتہ کو آزاد کرے۔ روز روز کا یہ لڑائی جھگڑا ہی ختم ہوجائے گا۔ وہ اپنے گھر میں خوش، ہم اپنے گھر میں خوش۔''

بالکل ٹھیک کہتے ہیں، رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے اور..... تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ عنایت اور اس کا باپ اپنی جگہ جو کچھ کررہے تھے اس سلسلے میں مجھ تک متضاد آرا پہنچی تھیں اور اِدھر شرافت بی بی جس انداز میں سوچ رہی تھی وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی، چاہے اس کا یہ عمل شگفتہ کے سسرال والوں کے رویوں کے ردعمل میں تھا۔ بہرحال، شرافت بی بی اس موڈ میں دکھائی دیتی تھی کہ اِدھر عنایت، شگفتہ کو رشتہ ازدواج سے آزاد کرے، اُدھر وہ اپنی بیٹی کو مہر مشتاق سے بیاہ دے۔

میرے لیے اب ٹوبہ ٹھلی والا میں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ میں جس مقصد کی خاطر وہاں پہنچا تھا، وہ پورا نہیں ہوسکا تھا۔ اگر عنایت حسین میرے ہتھے چڑھ جاتا تو خون آلود درانتی پر روشنی ڈال سکتا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور شرافت بی بی سے کہا۔

''میں عنایت کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ اس نے ٹوبہ ٹھلی والا میں قدم نہیں رکھا۔ تمہارے خیال میں وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے شروع میں مجھے بتایا تھا کہ عنایت نے اپنے باپ کو اُدھر کوٹ فرمان روانہ کردیا ہے۔ ہوسکتا ہے اِدھر آنے کے بجائے وہ خود بھی اپنی بہن کے گھر چلا گیا ہو؟''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ عنایت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت ابھی تک نہیں ہوسکی کہ آپ کو کس قسم کی معلومات چاہئیں؟''

''اگر عنایت حسین مل جاتا تو اس بات کی وضاحت بھی ہوجاتی۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ یہاں آیا ہی نہیں۔ اب اس کی تلاش میں مجھے کوٹ فرمان تک

سفر کرنا پڑے گا۔"

وہ بدستور بے اعتباری سے بولی۔ "تھانے دار صاحب! میں ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ نہیں بتانا چاہتے، نہ بتائیں۔ آپ کی مرضی ہے لیکن اگر عنایت آپ کو کہیں مل جائے تو اسے اس بات کے لیے تیار کرنے کی کوشش کریں کہ وہ میری بیٹی کی جان چھوڑ دے۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم نے شگفتہ کو مہر مشتاق سے بیاہنے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شادی، شادمانی کا نام ہے تھانے دار صاحب! اگر انسان کی زندگی میں خوشی نہ ہو تو ایسے جینے کا کیا فائدہ؟"

"ہوں!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر میں اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تو پکڑ کر سیدھا ٹوبہ جھلی والا لاؤں گا۔ پھر ساری باتیں اِدھر تمہارے گھر میں بیٹھ کر ہی ہوں گی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

میں اے ایس آئی بشارت مرزا کے ہمراہ شرافت بی بی کے گھر سے رُخصت ہونے لگا تو اسی وقت ایک گبرو جوان وہاں نمودار ہوا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے درمیان رہی ہوگی۔ مناسب قد و قامت کے ساتھ وہ متاثر کُن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی نظر مجھ سے ملی تو میں نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ وہ مجھے وہاں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔ اس چونکنے میں اچنبھے سے زیادہ تشویش شامل تھی۔ مجھے اس کا یہ ردعمل کچھ عجیب سا لگا۔

شرافت بی بی ہمیں رُخصت کرنے کے لیے دروازے تک چلی آئی تھی۔ وہ جلدی سے اس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے بولی۔ "تھانے دار صاحب! یہ اپنا مشتاق ہے...... مہر مشتاق!"

پھر وہ مشتاق کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ "مشتاقے پتر! یہ ملک صفدر حیات ہیں، اپنے علاقے کے تھانے دار۔ یہ اس لومڑ عنایت کے سلسلے میں تحقیقات کرنے ہمارے گھر آئے ہیں۔"

شرافت بی بی کا یہ اندازِ تعارف مجھے بالکل اچھا نہ لگا...... بلکہ بہت ناگوار گزرا۔ ٹھیک ہے، عنایت سے ان لوگوں کے کچھ اختلافات چل رہے تھے لیکن وہ بہر حال اس کا داماد تھا۔ اسے لومڑ کہہ کر بات کرنے کی کوئی تک بنتی تھی اور نہ ہی جواز نظر آتا تھا اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے سامنے جو اس کی بیٹی کے لیے اُمید لگائے بیٹھا تھا۔ ویسے تو مشتاق کی آمد کا انداز بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا، وہاں اندر ہی اندر بڑی خطرناک کھچڑی پک رہی تھی۔

مشتاق نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ اس فضول آدمی کے بارے میں کس قسم کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا اس نے کوئی قتل وغیرہ کر دیا ہے؟"

میں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "جوان! اس نے کسی کو قتل کیا ہے یا وہ کسی کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے، اس حقیقت سے بہت جلد پردہ اٹھنے والا ہے۔"

میں نے مہر مشتاق کی آنکھوں میں گہری تشویش کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اندر سے ہل کر رہ گیا تھا مگر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کریں جی...... تحقیق کریں۔ یہ بڑا نیک کام ہے......!"

ہم شرافت بی بی کے گھر سے باہر نکل آئے۔ دروازے کے قریب ہی ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اے ایس آئی نے میرا اور اپنا گھوڑا کھولا پھر ہم ان گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہم ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوئے تو اے ایس آئی نے مجھ سے کہا۔ "ملک صاحب! یہ بندہ مشتاق مجھے ٹھیک نہیں لگا۔"

میرا ذہن بھی اس وقت مسلسل مہر مشتاق کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ سرسری لہجے میں، میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ "کیا خرابی ہے اس میں؟ مجھے تو وہ اچھا خاصا لگا ہے۔ میں نے ابھی تک عنایت حسین کو نہیں دیکھا لیکن شگفتہ کو تو ہم دونوں ہی نے دیکھ لیا ہے۔ میرے خیال میں، شگفتہ اور مہر مشتاق کی جوڑی بڑی موزوں رہے گی۔"

"میں ان کی جوڑی یا شادی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

"پھر...... پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

ایسی بات نہیں کہ میں بشارت مرزا کا مقصد نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کس زاویے سے بول رہا ہے لیکن میں دانستہ اسے اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔ دراصل، اس وقت میرا ذہن کئی محاذوں پر ایک ساتھ نبرد آزما تھا۔ میں نے

محسوس کیا تھا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔ میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا، کون ہمارا پیچھا کر رہا ہے اور کیوں؟

اے ایس آئی نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

''ملک صاحب! میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ہمیں شرافت بی بی کے گھر میں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا جیسے اسے ہمارا وہاں آنا اچھا نہ لگا ہو۔ ہماری اس سے دوستی ہے اور نہ ہی دشمنی پھر اسے ایسے مشکوک رویے کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ اس حوالے سے بھی مشتاق کا چونکنا اور بدکنا بڑا معنی خیز ہے۔ ایسا ردعمل تو وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو...... یا جرم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

اے ایس آئی بشارت مرزا نے حالات و واقعات کا بڑا درست اور برمحل تجزیہ کیا تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی شخص نہایت ہی خفیہ انداز میں ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ کیا تم نے بھی ایسا ہی محسوس کیا؟''

میرے اس انکشافی سوال نے اے ایس آئی کو بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بڑبڑانے والے انداز میں اس کے منہ سے نکلا۔ ''میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔''

''دھیان نہیں دیا...... تو دو!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ تصدیقی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ مجھے یقین تھا اس نے بھی متعاقب کی جھلک دیکھ لی تھی۔ سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں ملک صاحب لیکن...... وہ بندہ مہر مشتاق نہیں۔''

''وہ مہر مشتاق نہیں لیکن اسی کا متعین کردہ کوئی بندہ تو ہو سکتا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ہم کافی دیر سے شرافت بی بی کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر مشتاق واقعی کسی قسم کے جرم میں ملوث ہے یا ایسا کوئی ارادہ رکھتا ہے تو وہ ہماری نگرانی پر اپنے کسی بندے کو مامور بھی کر سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''پھر کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس بندے پر ہاتھ ڈال دیں؟''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا خیال ہے، اس متعاقب کو اپنے پیچھے لگا کر توبہ ٹہلی والا سے باہر لاتے ہیں پھر اس کا مزاج بھی دریافت کر لیں گے۔''

اے ایس آئی نے میری تجویز سے اتفاق کیا لیکن ہم جیسے ہی گاؤں کی حدود سے باہر نکلے، متعاقب غائب ہو گیا۔ ہم نے کسی بہانے سے اپنے گھوڑوں کو روکا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے ہم اپنا گھوڑا بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن ہم اس توسط سے نامعلوم متعاقب کا ''جائزہ'' لینا چاہتے تھے۔ مگر ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ دور دور تک مذکورہ متعاقب کے آثار دکھائی نہ دیے۔

اے ایس آئی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''کیا خیال ہے ملک صاحب! واپس چل کر اس پُراسرار پیچھا کرنے والا کا کھوج لگائیں؟''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے نہیں اُمید کہ وہ اب ہمارے ہاتھ آئے۔''

اے ایس آئی نے کہا۔ ''مجھے پورا شک ہے، وہ بندہ مشتاق ہی کا بھیجا ہوا ہے۔''

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس بندے مہر مشتاق کی خفیہ نگرانی کرانا چاہتا ہوں تاکہ پتا تو چلے وہ کس قماش کا شخص ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا۔ ''یہاں توبہ ٹہلی والا میں میرے ایک دو جاننے والے ہیں۔ میں ان سے کام لے کر مہر مشتاق کے بارے میں مفید معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ آپ کہیں تو ابھی چلتے ہیں۔''

''ابھی واپسی کا رُخ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں۔ تم کل سے اس مشن پر لگ جاؤ۔ تم اور دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلو یہاں آؤ لیکن خیال رہے کہ تمہیں یہ کام سادہ لباس میں رہتے ہوئے کرنا ہے تاکہ یہاں کسی کو پولیس کی سرگرمی کا احساس نہ ہو۔ تم اپنے قابلِ بھروسا جاننے والے سے ملو اور اپنے مطلب کی باتیں جاننے کی کوشش کرو۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبلو کو خصوصی ہدایت دے کر مہر مشتاق کی خفیہ اور محتاط نگرانی پر مامور کر دو۔ مجھے بہت جلد حوصلہ افزا نتائج چاہئیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں کل ہی اس مشن پر جت جاتا ہوں۔ بہت جلد آپ مجھے اس محاذ پر سرخرو ہوتا دیکھیں گے۔''

''انشاءاللہ۔'' میں نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور توبہ ٹہلی

والا سے موضع سوہدرہ کلاں کی جانب سفر شروع کردیا۔ مغرب کی اذان سے قبل ہم تھانے پہنچ گئے۔

☆☆☆

آئندہ روز اے ایس آئی کو ٹوبہ ٹہلی والا بھیجنے کے بعد میں خود کوٹ فرمان کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے ساتھ حوالدار خوش بخت بھی تھا۔ دراصل خوش بخت بھی کوٹ فرمان ہی کا رہنے والا تھا اور وہاں کے ایک ایک بندے سے بخوبی آشنا تھا اسی لیے میں نے خاص طور پر اسے اپنے ہمراہ کرلیا تھا تاکہ کسی معاملے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

کوٹ فرمان اور سوہدرہ کلاں میں کم و بیش چار میل کا فاصلہ حائل تھا اور یہ گاؤں ہمارے تھانے سے شمال میں واقع تھا۔ ہم دس بجے کے اریب قریب کوٹ فرمان پہنچ گئے۔ خوش بخت مجھے سیدھا شکور کے دروازے تک لے گیا اور میرا اشارہ پاتے ہی اس نے دروازے پر دستک بھی دے دی۔

شکور، کوٹ فرمان کا ایک چھوٹا زمیندار تھا اور رشتے میں وہ ہمارے مطلوبہ بندے یعنی عنایت حسین کا بہنوئی تھا۔ اس کی پانچ اولادیں تھیں اور وہ طویل عرصے سے یہاں رہ رہا تھا۔ حوالدار خوش بخت کی رپورٹ کے مطابق شکور ایک امن پسند اور صلح جو شخص تھا۔ لڑائی بھڑائی اور فتنہ پروری کے کاموں سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

غلام لوہار کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ عنایت نے سوہدرہ کلاں چھوڑنے سے دو تین روز قبل اپنے باپ کرامت حسین کو کوٹ فرمان بھیج دیا تھا کہ چند روز اپنی بیٹی صغریٰ کے پاس رہ آئے۔ عنایت کے بارے میں عمومی رائے یہ تھی کہ وہ مکان اور زمین کی فروخت کے بعد اپنی سسرال کو پیارا ہوگیا ہوگا اسی لیے میں نے سب سے پہلے ٹوبہ ٹہلی والا کو چیک کیا تھا لیکن عنایت کی وہاں موجودی کے آثار نہیں ملے تھے۔

دستک کے جواب میں ایک بارہ تیرہ سالہ بچے نے دروازہ کھولا۔ وہ خوش بخت کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اتفاق سے اس وقت شکور گھر پر موجود تھا۔ جلد ہی ہم اس گھر کی بیٹھک میں بیٹھے شکور اور اس کی بیوی کو اپنی آمد کی غرض و غایت بتا رہے تھے۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بیان کردہ کہانی سنی اور ہکا بکا رہ گئے۔ شکور نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''چاچا کرامت تو ایک طویل عرصے سے ہمارے گھر نہیں آیا حالانکہ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ وہ ادھر ہی ٹھہر جائے۔ بڑھاپے میں بہو کے ہاتھوں اپنی مٹی خراب نہ کرائے لیکن وہ سنتا ہی نہیں۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بیٹی کے در پر پڑے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ آپ نے عنایت کی بھی بڑی خوب کہانی سنائی ہے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ خبر نہیں کہ عنایت نے اپنا گھر بار فروخت کردیا ہے۔ آپ کی بات پر یقین کررہا ہوں لیکن میرے خیال میں عنایت نے زمین بیچ کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ زمیندار تو زمین کو پھیلانے بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے اور وہ......'' اس نے جملہ افسوس ناک انداز میں ادھورا چھوڑا اور نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں اپنی کہانی میں انہیں یہ بھی بتا چکا تھا کہ عنایت کی تلاش میں، میں ٹوبہ ٹہلی والا کی خاک چھان چکا ہوں۔ اسی تناظر میں صغریٰ بی بی نے کہا۔

''ابا جی یہاں نہیں پہنچے اور عنایتا اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا نہیں گیا تو پھر یہ دونوں کہاں غائب ہیں؟''

''یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔'' میں نے اُلجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔'' صغریٰ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور پوچھ لیا۔ ''کیسا چکر؟''

''یہ شرافت بی بی بڑی بدمعاش عورت ہے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جو عورت اپنی بیٹی کا گھر بسنے نہ دے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ مجھے شک ہے، اسی نے عنایتا اور ابا جی کو کہیں غائب کیا ہے۔''

صغریٰ دور کی کوڑی لائی تھی۔ میں گزشتہ روز شرافت بی بی سے ایک بھرپور ملاقات کرکے آیا تھا۔ مجھے بھی وہ خاصی تیز طرار اور موقع پرست لگی تھی لیکن وہ اپنے سمدھی اور داماد کو کہیں غائب بھی کرواسکتی ہے اس بارے میں، میں نے نہیں سوچا تھا البتہ میں نے یہ واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ شگفتہ کو عنایت سے طلاق دلواکر مہر مشتاق سے بیاہنے کی خواہاں تھی۔ صغریٰ چونکہ شگفتہ کی نند تھی اس لیے اس کی سوچ کا زاویہ قدرے مختلف تھا۔ میں نے اس کا مؤقف جاننے کے لیے پوچھ لیا۔

''کیا وہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے؟'' میرا اشارہ شرافت بی بی کی طرف تھا۔

وہ زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ اس عورت کی مکاریوں اور چال بازیوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ صرف نام کی شرافت بی بی ہے ورنہ......

توبہ توبہ!'' اس نے ذرا توقف کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولی۔

''اگر وہ واقعی بھلی مانس اور شریف عورت ہوتی تو بیٹی کے گھر کا سکون برباد کرنے کی کوشش کبھی نہ کرتی۔ عنایت کے گھر میں شگفتہ کو آخر تکلیف ہی کیا ہے لیکن ماں اس کے کان بھرتی ہے کہ اپنے خاوند کو تنگ کرتا کہ وہ بوڑھے ابا جی کو گھر سے نکال دے۔ آپ خود بتائیں تھانے دار صاحب! ابا جی اس عمر میں کہاں جائیں۔ آپ جانتے ہیں، بڑھاپے میں انسان بڑا چڑچڑا اور تنقیدی ہو جاتا ہے۔ ابا جی کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ کوئی غلط بات دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ شگفتہ کی جو حرکتیں اور چھن ہیں وہ ابا جی کو اچھے نہیں لگتے۔ وہ اسے گاہے بہ گاہے روکتے ٹوکتے رہتے تھے اور یہی بات اسے منظور نہ تھی اسی لیے آئے دن گھر میں فساد ڈال کر وہ میکے چلی جاتی ہے۔ میں نے ابا جی کی منت کی ہے کہ وہ ہمارے پاس آ جائیں لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ کو پتا نہیں، یہ شرافت بی بی کتنی کمینی عورت ہے۔ وہ ہر بار عنایتا سے یہی مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ابا جی کو گھر سے باہر کرے پھر شگفتہ اس گھر میں قدم رکھے گی۔ عنایتا ان سے جھوٹا سچا وعدہ کر کے بیوی کو گھر لے آتا ہے لیکن بتائیں، وہ باپ کو کیسے گھر سے نکال دے۔ وہ باپ جس کے سائے میں ہم پل بڑھ کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس نے خود کو بھوکا رکھ کر ہمارا پیٹ بھرا ہے۔ وہ خود کڑی دھوپ میں جلا ہوگا لیکن گرم ہوا کا ایک جھونکا ہم تک نہیں پہنچنے دیا۔ ہماری ماں چھوٹی سی عمر میں ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ ابا جی نے ہمیں ماں بن کر پالا ہے اور ایک باپ بن کر پروان چڑھایا ہے۔ ایسے سایہ دار درخت کو کوئی کیسے کاٹ کر پھینک سکتا تھا۔''

وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی اور میں نے اس کے بیان میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تاکہ اس کے دل کا غبار دُھل جائے۔ پتا نہیں، کب سے اس نے یہ طوفان اپنے سینے میں باندھ رکھا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے عنایتا کو بہت سمجھایا ہے۔ شکور نے بھی کہا ہے کہ شگفتہ جب اس کے گھر میں نہیں بسنا چاہتی تو لعنت بھیجے اس پر۔ ہم کسی اچھی اور بھلی مانس لڑکی سے خود اس کی شادی کرائیں گے۔ اولاد ہو جائے تو اس رشتے کو توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں مگر عنایتا مانتا ہی نہیں۔ وہ کسی بھی صورت شگفتہ کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ لگتا ہے ان ماں بیٹی نے اس پر کالا جادو کر دیا ہے یا اسے اُلو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ ویسے یہ شگفتہ کمبخت ہے بھی تو اتنی خوبصورت نا......!''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر اچانک خاموش ہو گئی۔ میں چونکہ گزشتہ روز خود اپنی آنکھوں سے شگفتہ کو دیکھ چکا تھا لہٰذا یہ سمجھنے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ صغریٰ بی بی کہنا چاہتی تھی...... کمبخت شگفتہ اتنی خوبصورت بلا ہے کہ کوئی بھی مرد آسانی سے اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔

ہم نے آدھا پونا گھنٹا شکور زمیندار کے گھر میں گزارا پھر وہاں سے اٹھ گئے۔ طے یہی پایا تھا کہ اگر مجھے عنایت اور کرامت کی کوئی خبر ملے تو میں انہیں اطلاع کر دوں گا اور اگر وہ لوگ ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں تو فوراً تھانے آ کر مجھے خبر کریں گے۔

ہم شکور کے گھر سے نکلے تو حوالدار خوش بخت ضد کر کے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اسی کے گھر میں کھایا پھر ظہر کی نماز کوٹ فرمان کی مسجد میں ادا کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

☆☆☆

آنے والے تین روز کسی قابلِ ذکر کارروائی کے بغیر ہی گزر گئے۔ ٹوبہ ٹہلی والا سے گاہے بہ گاہے مجھے رپورٹ مل رہی تھی لیکن اس رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر فوراً حرکت میں آ جاتا۔ مہر مشتاق کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ بہت ہی جوشیلا اور جی دار جوان ہے لیکن وہ کسی ایسی کارروائی میں ملوث نہیں پایا گیا تھا کہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاتی البتہ یہ خبر مجھ تک پہنچی تھی کہ وہ نہایت پابندی کے ساتھ آزادانہ طور پر شرافت بی بی کے گھر آتا جاتا ہے۔ جس گھر کے لوگ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں وہاں کوئی کیوں نہیں جائے گا۔

مزید ایک ہفتے تک میں نے عنایت اور کرامت کی تلاش کا کام جاری رکھا۔ میں نے اپنے بندے اردگرد کے گاؤں دیہات میں دور تک پھیلا دیے تھے اور انہیں سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان باپ بیٹے میں سے جو بھی اور جس حالت میں بھی نظر آئے اسے فی الفور میرے سامنے حاضر کیا جائے۔ ایسی متلاشی ہر ٹیم کے ساتھ میں نے ایک ایک ایسے مقامی بندے کو بھی نتھی کر دیا تھا جو عنایت اور کرامت کا صورت آشنا تھا تاکہ پولیس پارٹی کو ان کی تلاش اور شناخت

کے سلسلے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب تک عنایت میرے ہتھے نہ چڑھتا، خون آلود درانتی کا معما حل نہیں ہوسکتا تھا جب تک یہ معما حل نہ ہوتا، میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اسی بھاگ دوڑ اور ادھیڑ بن میں پندرہ روز گزر گئے لیکن کامیابی کا کوئی کونا، کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونے لگا۔ ممکن تھا کہ میں ہمت ہار کر اس کیس کی فائل کو داخلِ دفتر کردیتا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آ گیا۔

ایک صبح میں تھانے میں آ کر اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے اطلاع ملی کوئی شخص بیری والے کھوہ میں گر گیا ہے۔ بیری والا کھوہ (کنواں) موضع سوہدرہ کلاں کی حدود میں ہی واقع تھا۔ یہ ایک متروک کنواں تھا لیکن پچھلے دنوں ہونے والی لگاتار بارشوں نے دیگر گڑھوں کے ساتھ اس میں بھی اچھا خاصا پانی بھر دیا تھا۔ کسی شخص کے متروک کنویں میں گرنے کی خبر خاصی سنسنی خیز تھی چنانچہ میں حوالدار خوش بخت اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر فوراً جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔

موقع پر لگ بھگ درجن بھر افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے ساتھ ہی جائے حادثہ پر لگی بھیڑ چھٹ گئی۔ میں کنویں کی منڈیر پر پہنچا اور اُکڑوں بیٹھ کر اندر جھانکا۔ کنویں کے اندر خطرناک حد تک برساتی پانی موجود تھا اور اس پانی میں کوئی شے ڈوب اُبھر رہی تھی۔ میں نے ''شے'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ مجھے اس کے خدوخال واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس شے (شخص) کو کنویں سے باہر نکالنے کا تھا اور اس سلسلے کے حل کے لیے کنویں کے اندر اترنا ضروری تھا۔ میں نے وہاں پر موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی مضبوط رسے کا فوراً انتظام کرو۔''

ایک شخص نے آگے بڑھ کر مجھے مطلع کیا۔ ''تھانے دار صاحب! عبدالرحمٰن رسا لینے ہی گیا ہے۔'' پھر اس نے گاؤں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا اور قدرے مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''شاید...... وہ واپس آ رہا ہے...... اس کے ہاتھ میں رسا بھی دکھائی دے رہا ہے۔''

وہاں پر موجود افراد کی نظریں دور سے آتے ہوئے عبدالرحمٰن نامی اس شخص پر جم گئیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اسی عبدالرحمٰن نے ایک بندے کو کنویں میں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ عبدالرحمٰن اس وقت اپنے کھیتوں میں کام کررہا تھا۔ اس نے آواز دے کر چند لوگوں کو کنویں کے پاس جمع کرلیا تھا پھر وہ خود رسا لینے اپنے گھر کی سمت روانہ ہوگیا تھا۔

عبدالرحمٰن رسا لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ اس مسئلے کا ایک مرحلہ طے ہوگیا تھا۔ دوسرا مرحلہ کنویں کے اندر اترنے اور ڈوبتے ہوئے شخص کو باہر نکالنے کا تھا اور یہ خاصا مشکل اور آزمائشی مرحلہ تھا۔ کنویں کے اندر کھڑا پانی پگھلی ہوئی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا اور اوپر سے موسم کے تیور بھی بڑے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ رگوں میں خون منجمد کردینے والی یخ بستہ ہوائیں فضا میں ہر طرف چکراتی پھر رہی تھیں۔ میں نے وہاں موجود افراد کے چہروں کا جائزہ لیا اور ہر چہرے پر ایک ہی سوال کو مجسم پایا...... کنویں میں کون اترے گا؟

یہ ایک ایسا ہی سوال تھا جیسے ہر چوہا دوسرے چوہوں سے پوچھ رہا ہو...... بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟

اس دوران میں عبدالرحمٰن نے گھر سے لائے ہوئے رسے کا ایک سرا نزدیکی درخت کے تنے کے ساتھ نہایت ہی مضبوطی سے گرہیں دے کر باندھ دیا۔ رسے کے دوسرے آزاد سرے سے باآسانی کنویں میں اترا جاسکتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی پُرعزم حرکات و سکنات نے فوراً سے پیشتر مجھے بتادیا کہ وہ درجن بھر چوہوں میں خود کو شیرِ ببر ثابت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

عبدالرحمٰن کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی مگر مسلسل محنت اور کسرت نے اس کے وجود کو تندرستی اور توانائی بخش رکھی تھی۔ مضبوط کاٹھی کا مالک عبدالرحمٰن اب بھی کئی جوانوں سے زیادہ جوان تھا۔ وہ رسے کا آزاد سرا تھامے کنویں کی منڈیر کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔

وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رسا لے لیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عبدالرحمٰن! تم نے جتنا کردیا وہی کافی ہے۔ اب قانون کی باری ہے۔''

وہ کوئی سوال، کوئی اعتراض کیے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔

اسی لمحے حوالدار خوش بخت تیزی سے آگے بڑھا اور میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ولولہ انگیز لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میرے ہوتے ہوئے آپ یہ نہیں کرسکتے۔''

حوالدار کا انداز اتنا حتمی اور دوٹوک تھا کہ میں سوچ میں پڑ گیا لیکن فیصلہ کرنے میں، میں نے ایک سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لیا اور رسا حوالدار کی طرف بڑھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''خوش بخت! تم نے مگرمچھ کی چربی سے تیار ہونے

والے گھی میں گوشت بھون بھون کر کھایا ہوا ہے۔ یہ سردی تمہارا کیا بگاڑے گی۔ تم خوشی سے اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔''

وہ پھول کر جی داری کی ہمت کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ جب وہ بڑی مہارت سے کنویں کی دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کر رسے کی مدد سے اندر اتر رہا تھا تو اس کی فخریہ جوش بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب! آج آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا اور آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میرے جسم میں چبھنے والی سوئیوں کا سبب کیلشیم اور بی کمپلیکس کی کمی نہیں بلکہ یہ تو مگرمچھ مار کا اصلی گھی کا کرشمہ ہے۔''

پندرہ بیس منٹ کی کھینچا تانی کے بعد ہم خوش بخت کے تعاون سے اس مصیبت زدہ شخص کو کنویں سے باہر لانے میں کامیاب ہوگئے اور اسی لمحے مجھے ماننا پڑا کہ حوالدار کی چربی میں ضرور کسی مگرمچھ کی چربی شامل ہوگئی ہے۔ موسم کی شدت اس پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نگاہ جما کر تعریفی انداز میں اسے دیکھا اور متاثرہ شخص کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس شخص کے سر اور شیو کے بال بے طرح بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کئی ماہ سے اس نے اس طرف توجہ نہ دی ہو۔ جسم پر موجود کپڑے بھی بے حد میلے تھے پھر ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرنے کے سبب اس کی حالت اور بھی مخدوش اور غیر ہو رہی تھی۔

موقع پر موجود ہر شخص تنقیدی نظر سے اسے دیکھ رہا تھا پھر کسی شخص کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میری سماعت تک ان الفاظ نے رسائی حاصل کی۔

''یہ تو عنایت حسین ہے...... دیکھو ذرا، اس نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

اس شخص کا یہ انکشافی جملہ ٹھہرے ہوئے تالاب میں پہلا پتھر ثابت ہوا۔ ان تمام افراد کا تعلق سوہدرہ کلاں سے تھا لہٰذا طرح طرح کے تصدیقی اور تحیر آمیز جملے میری سماعت تک پہنچنے لگے اور ان تبصروں کا لب لباب یہ تھا کہ حوالدار خوش بخت نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس شخص کو متروک کنویں سے باہر نکالا تھا وہ عنایت حسین ولد کرامت حسین سابقہ سکنہ موضع سوہدرہ کلاں تھا...... وہی عنایت حسین جس کی تلاش میں، میں پچھلے بیس پچیس دن سے بے قرار تھا۔ وہ مجھے ملا بھی تو اس حالت میں کہ میں اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

میں نے فوری اور ہنگامی انتظامات کے تحت عنایت حسین کو اسپتال بھجوا دیا اور اس کے ساتھ ہی کوٹ فرمان اور ٹوبہ ٹہلی والا بندے دوڑا دیے تاکہ عنایت کے ورثا کو اس کی بازیابی کی خبر ہو جائے۔

ٹوبہ ٹہلی والا سے تو کوئی نہ آیا لیکن شام سے پہلے صغریٰ اپنے خاوند شکور کے ہمراہ میرے پاس پہنچ گئی۔ میں ان دونوں کو اپنے ساتھ اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر سے ملاقات کی تو اس نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! ہم نے بندے کو ضروری ٹریٹمنٹ دے دیا ہے اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اسپتال سے لے جا سکتے ہیں۔'' لمحے بھر کا توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''ہائی داوے ملک صاحب! یہ پاگل آپ کو ملا کہاں سے؟''

''پاگل؟'' میں نے بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اس شخص کا ذہنی توازن اپنے ٹھکانے پر نہیں۔ میں نے مختلف ترکیبوں سے اچھی طرح اسے ٹیسٹ کیا ہے۔ یہ شخص سو فیصد پاگل ہے۔ لگتا ہے کسی شدید ترین صدمے نے اس کا دماغ اُلٹ دیا ہے۔ آپ اسے پاگل خانے میں جمع کرا دیں تو اچھا ہے۔ یہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ خود کو نوچتا ہے، دانتوں سے کاٹتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مخصوص جملے دُہرانے لگتا ہے پھر دیوار سے سر ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے کنٹرول کر رکھا ہے۔''

ڈاکٹر کی رپورٹ نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں اس کی ماہرانہ اور پیشہ ورانہ رائے کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا تجسس سے لبریز لہجے میں پوچھ لیا۔ ''وہ کس قسم کے مخصوص جملے دُہراتا ہے؟''

''مثلاً...... میں بہت ظالم انسان ہوں۔ میں نے اپنے باپ پر بہت ظلم کیا اور وہ بھی ایک عورت کی خاطر...... بیوی کی خوشنودی کے لیے انسان کو اپنی جڑ کا دشمن تو نہیں ہو جانا چاہیے نا؟ اس نے کہا، اپنے باپ کا بندوبست کرلو...... اور میں نے بندوبست کر دیا۔ مجھے جتنی بھی عبرت ناک سزا دی جائے وہ کم ہے لیکن...... کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ لوگ مجھے سزا دینے کے بجائے مجھ پر ترس کھاتے ہیں اور مجھے پاگل دیوانہ سمجھتے ہیں جبکہ میں پاگل نہیں ہوں۔ وہ پاگل

ہیں جو میری بات نہیں سمجھتے۔ میں نے کتنی مرتبہ مرنے کی کوشش کی مگر مجھے بچالیا جاتا ہے۔ میں اندھے کنویں میں کودا۔ خیال تھا کہ کسی نے مجھے خودکشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا لیکن میری قسمت بری کہ ایک مرتبہ پھر مجھے بچالیا گیا۔ واقعی...... میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ مجھے بار بار مارا اور بچایا جائے گا۔ میں پاگل نہیں ہوں......اس قسم کے جملے بول کر وہ دیواروں سے سر ٹکرانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔"

ڈاکٹر مجھے عنایت حسین کی دماغی حالت کے بارے میں بتارہا تھا اور میں اپنے تصور میں بھی دندانے دار خون آلود درانتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منحوس درانتی جس کے بے رحم پھل سے عنایت حسین نے اس مہربان اور سایہ دار درخت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی جو بچپن سے اب تک اس پر سایہ فگن رہا تھا۔ زندگی کی راہ میں بچھے کانٹوں کو اس نے اپنے وجود میں اتار کر عنایت کے لیے نرم و گداز آغوش وا کی تھی۔ وہ زندگی بھر کڑی دھوپ میں جلا تھا مگر اس دھوپ کی ایک موہوم سی کرن بھی اس نے عنایت کے چہرے تک نہیں پہنچنے دی تھی کہ کہیں وہ معصوم ذرا سی تپش سے کملانہ جائے۔

والدین کس طرح خونِ جگر پلا پلا کر اپنی اولاد کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن بڑا ہونے کے بعد بعض نامعقول اور سفاک اولادیں اس چراغ کو گل کرنے سے بھی نہیں چوکتیں جس کی مستعار روشنی سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہو۔ اس وقت میرے دل سے بے ساختہ یہ دُعا نکلی۔

"اے میرے پروردگار! تُو ہر بے رحم اور سفاک شخص کو صاحبِ اولاد کردے۔"

پتا نہیں یہ دُعا تھی یا بددُعا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ والدین کے دُکھ درد کو اس وقت تک حقیقی معنوں میں محسوس نہیں کیا جاسکتا جب تک انسان خود والدین کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔

میں نے خود وارڈ میں جاکر بھی عنایت کی حالت کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ حرف بہ حرف دُرست تھا۔ واقعی عنایت حسین کا دماغ پھر گیا تھا اور وہ اس حالت میں جو کچھ بھی بک رہا تھا وہ درحقیقت اس کا اقرارِ جرم تھا۔

میں نے عنایت حسین کو صغریٰ اور شکور کے حوالے کردیا اور کرامت علی کی لاش کی بازیابی کے لیے ایک مرتبہ پھر سرگرمِ عمل ہوگیا۔ آلۂ قتل وہ خون آلود درانتی میرے قبضے میں تھی۔ میں نے اس تلاش کا آغاز ماسٹر جمیل کے گھر سے کیا۔

پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماسٹر جمیل کو ملنے والی درانتی کتنی افسوس ناک اور گمبھیر کہانی کو جنم دے گی۔ ماسٹر کے گھر (جو کچھ عرصہ پہلے عنایت حسین کا گھر ہوا کرتا تھا) کا جائزہ لیتے ہوئے میں مکان کے عقبی حصے میں بھی گیا تھا جدھر تنور اور مویشیوں کی کنڈلی بنی ہوئی تھی۔ اس حصے کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس وقت میں اپنے اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا لیکن اب میرا ذہن چیخ چیخ کر مجھے مطلع کررہا تھا کہ مجھے مکان کے اسی حصے میں کرامت حسین کی لاش کو تلاش کرنا چاہیے۔

میں بڑی پیشہ ورانہ باریکی سے ایک ایک شے کو کھوجتا ہوا بالآخر اس کونے تک جا پہنچا جہاں خشک لکڑیوں اور اُپلوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ میں نے ان اُپلوں اور لکڑیوں کو ہٹوا کر زمین کا معائنہ کیا تو یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہاں ایسے آثار موجود تھے جیسے وہاں کی زمین کو کھود کر دوبارہ بھرا گیا ہو۔

میرے لیے اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔ میں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بندوں کو حکم دیا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں کھدائی شروع کریں۔ میرا یہ فیصلہ بہت سودمند ثابت ہوا۔ ابھی ان لوگوں نے زمین کو ڈیڑھ دو فٹ گہرائی تک ہی کھودا تھا کہ کرامت حسین کی لاش جلوہ افروز ہوگئی۔ ہم نے جب اس لاش کو باآہستگی باہر نکالا تو میرا اندازہ صد فیصد دُرست ثابت ہوا۔ کرامت حسین کو درانتی کی مدد سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ عنایت کی اس سفاکی اور بربریت پر میری گردن ندامت سے جھک گئی۔

عنایت ایسا نابکار اور نامعقول شخص اس دنیا کی سخت ترین سزا کا مستوجب تھا لیکن افسوس کہ میں اسے کوئی سزا دلوانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ بعض معاملات میں دستِ قدرت اتنی سرعت سے حرکت میں آتا ہے کہ دنیاوی قانون و قاعدے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس ذاتِ پاک نے عنایت کو ایسے عبرت ناک عذاب میں مبتلا کردیا تھا کہ دیکھنے والوں کے لیے ایک زندہ سبق تھا۔

ڈاکٹر نے مجھے بڑے ٹھوس الفاظ میں باور کرادیا تھا کہ عنایت کا پاگل پن عارضی اور قابلِ علاج نہیں تھا۔ وہ جب تک بھی زندہ رہتا، اسے اسی طرح خود کو نوچنا اور کھسوٹنا تھا......اور کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کتنے عرصے تک زندہ رہے گا، سوائے اس قدرت کے۔

قدرت جب براہِ راست کسی شخص سے انتقام لینے پر آتی ہے تو ایسے ہی دیدۂ عبرت تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

(تحریر: حسام بٹ)